ترتیب

دودھ اور خون

دُودھ اور خون

بھارت ماتا کے نام

جس کا خون ارزاں ہے مگر دُودھ گراں
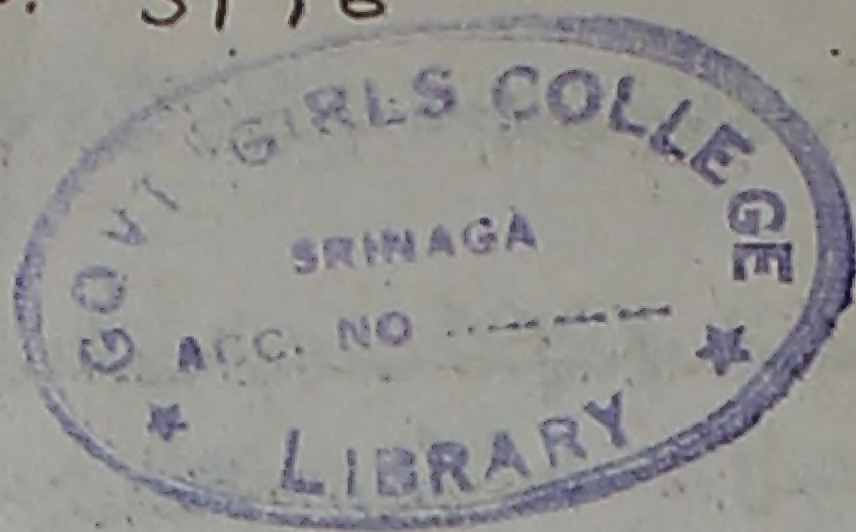
پیش لفظ

ادب کا سماجی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ کوئی بھی ادب خلا میں نہیں پنپتا۔ ادب سماجی ماحول سے غذا حاصل کرتا ہے اس لئے کسی ادیب کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے لئے ان سماجی حالات کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے جن کے ماتحت اس نے کام کیا ہے۔

پچھلی دو صدیوں میں ہماری سماجی زندگی کی تشکیل میں سب سے زیادہ ہاتھ برطانوی سامراج کا رہا ہے۔ اس نے ہمارے تخلیقی سرچشموں کو اُبلنے سے روکا ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں فقط رِسنے کی اجازت دی ہے۔ کبھی آزادی سے بہنے نہیں دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں ایک حد تک صنعتی ترقی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کو بھی فروغ ہوا ہے۔ لیکن قومی زندگی میں جاگیرداری رشتے بدستور حاوی رہے ہیں۔ غریبی

بیماری اور جہالت برابر بڑھتی گئی ہے اور ہماری تہذیبی زندگی دن بدن ٹھٹھری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ حالات علم و ادب کے پھلنے پھولنے کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ ایسے سماجی نظام میں پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور لکھنے والوں کی اور بھی کم۔ اور جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بیشتر زندگی کی سطح کو چھوتا ہے۔ اس کی گہرائی تک نہیں پہنچتا۔ چنانچہ ہمارے ادب کی کم مائیگی اس کا ایک ثبوت ہے

لیکن کوئی بھی طبقہ داری سماج جس میں ایک طبقہ دوسرے کا خون چوس چوس کر موٹا ہوتا ہے، اپنے وجود کو بہت عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکتا طبقاتی کشمکش ایسے سماج کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔ محکوم اپنی زنجیروں کو توڑنے کے لئے جو جد و جہد کرتا ہے اس سے اس کے دل و دماغ میں نئے شعور کے دیئے جلتے ہیں۔ ان کی روشنی میں وہ اپنے اس بہروپئے حریف کو بخوبی پہچان لیتا ہے جو اسے طرح طرح کے بھیس میں فریب دیتا رہا ہے۔ چاہے وہ رسم و رواج کے روایتی لباس میں آئے یا مذہب و اخلاقیات کی مقدس عبا میں لپٹا ہوا۔ چاہے وہ آئین و دستور کے پُر جلال روپ میں نمودار ہو یا تہذیب و شائستگی کے باوقار جامے میں۔ غرض ہر شکل و صورت میں وہ اسے بھانپ جاتا ہے ہماری تاریخ بھی اس کی شاہد ہے۔ سامراجی پشت پناہی کے باوجود جاگیرداری نظام چند سال کے ترقی یافتہ شعور کی زد سے نہ بچ سکا۔ اس شعور نے جاگیرداری کے کریہہ چہرے سے خوش رنگ نقاب ہٹا کر اس کے اصلی روپ کو نمایاں کر دیا ہے۔ اس شعور کی جھلک ہمارے ادب میں بھی ملتی ہے۔

ہمارے ادب کا یہ حصہ بہت ہی صحت مند اور توانا ہے. کیونکہ وہ اجڑی اور گھٹی ہوئی زندگی کی جگہ بھرپور اور وسیع زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے. کھلی ہوئی فضاؤں میں پرواز کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے، اور ایک ایسی نئی دنیا بنانے کی دعوت دیتا ہے جو ہمیشہ سے انسان کے خواب مرکزی رہی ہے۔

مبارک ہیں وہ ادیب جن کا اس قسم کے ادب کی تخلیق میں حصّہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی نگارشات کے ذریعے نہ صرف اپنے شعور کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ پڑھنے والوں کے شعور کو بھی جلا دیتے ہیں اور اس طرح ایک نئی زندگی کو جنم دیتے ہیں۔ ترقی پسند قوتوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

ادیبوں کی اس برادری میں تمام اصناف ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ان میں شاعر بھی ہیں اور انشا پرداز بھی۔ ناول نویس بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی. لیکن شاید اثر اور مقبولیت کے لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ اہمیت افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔

افسانہ نگاروں کے کارواں میں ہمارے بہت سے نوجوان ادیب منزل بہ منزل آگے بڑھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ صدیقہ بیگم بھی ان ہی ادیبوں کی ہم سفر ہیں۔

صدیقہ نے اردو کی افسانوی دنیا میں خاصی شہرت حاصل کرلی ہے ان کے افسانے وقتاً فوقتاً اردو کے معیاری رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن کے افسانوں کے دو مجموعے 'ہچکیاں' اور "پلکوں میں آنسو" کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۴ء میں چھپا تھا جس میں ان کے شروع شروع کے افسانے شامل تھے۔ ان افسانوں میں زیادہ تر متوسط طبقہ کی زندگی کا عکس ملتا ہے کہ وہ کون کون سی سماجی پابندیوں، مالی دشواریوں اور جذباتی الجھنوں کا شکار ہے۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے جو کچھ دیکھا ہے بیان کر دیا ہے۔ ابھی ان کے مشاہدہ میں کوئی زیادہ گہرائی نہیں ہے۔ واقعات کے تجزیہ میں شعور کی کمی کھٹکتی ہے، لیکن اس میں اُن کا کیا قصور ہے۔ مشاہدہ کی گہرائی اور شعور کی پختگی تو بڑی ریاضت اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ پھر کسی بنگالی فن کار کے یہاں اس کا نہ ہونا کیا تعجب کی بات ہے۔ اور خاص طور پر اس حالت میں جب کہ وہ ہر طرف جاگیرداری سماج کی پابندیوں سے گھرا ہوا ہو۔ اصل میں ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ کوئی فنکار منزلِ فن پر کس طرح گام زن ہوتا ہے۔ کیا اس کا ہر قدم شاہراہِ حیات سے وابستہ رہتا ہے۔ اور زندگی کی سرسبز اور شاداب وادی کی کھوج میں سوزِ یقین کے ساتھ آگے بڑھتا ہے یا وہ زندگی کو گمراہ کر دینے والی بھول بھلیاں میں کھو جاتا ہے۔ اور وہم و گمان کے اندھیارے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ صدیقہ نے زندگی کا روشن راستہ اختیار کیا ہے۔ ان کے فن میں ایک مسلسل نشوونما دکھائی دیتی ہے۔ اُن کا شعور بتدریج اُبھر رہا ہے۔ اس کا ثبوت ان افسانوں میں ملتا ہے جو ان کے دوسرے مجموعے "پلکوں میں آنسو" میں شائع ہوئے ہیں اور یہی چیز ان افسانوں سے بھی ٹپکتی ہے جو اب "دودھ اور خون" میں چھپنے جا رہے ہیں۔

صدیقہ یو۔ پی میں مسلمانوں کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں اور اُن کی تعلیم و تربیت روایتی انداز میں گھر ہی کے اندر ہوئی۔ جاگیرداری رسم و رواج کے شکنجوں کو اُنھوں نے ذاتی طور پر محسوس کیا۔ انھیں اس گھٹن کا تجربہ ہے جس میں اُن کے طبقے کے نوجوان مبتلا ہیں۔ اور خاص طور پر انھیں لڑکیوں کی جذباتی کش مکش کا شدید احساس ہے۔ جو جاگیردارانہ نظامِ اخلاقیات کی اور زیادہ شکار ہیں۔ اُن پر جو کچھ گذرتی ہے اُسے وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔ اُن کی محرومیوں، مجبوریوں، تمناؤں اور امیدوں سے وہ بخوبی آشنا ہیں۔ لیکن ہمارے سماج میں اس بارے میں زبان کھولنا اور خاص طور پر ایک خاتون کے لئے بڑی ہمت کی بات ہے۔ صدیقہ ہمارے دیس کی اُن چند خواتین میں ہیں جنھوں نے اپنے فن کے ذریعے ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ جو جاگیرداری نظام میں عورت کی قسمت کا لکھا سمجھا جاتا ہے۔

یوں تو صدیقہ کے افسانوں میں ہمیں تمام مظلوم انسانیت کے کراہنے اور سسکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن سوز و گداز اور درد و کرب کا سب سے زیادہ احساس وہاں ہوتا ہے جہاں وہ متوسط طبقہ کی زندگی اور خاص طور پر عورتوں کی گھریلو زندگی کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہاں ہمیں اُن کی کردارنگاری میں اُن کے خلوص و محبت اور حقیقت پسندی کے حسین نمونے ملتے ہیں مثلاً "تارے لرز رہے ہیں" اس لحاظ سے اُن کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس میں اس تعصب کو موثر انداز میں واضح کیا گیا ہے جو عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہمارے متوسط طبقہ میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ یا اسی طرح اُن کے

افسانے "عمل اور ردِّ عمل" اور "آن دیکھی راہیں" متوسط طبقہ کی جنسی زندگی کی گھٹن اور بے راہ روی کی اچھی عکاسی کرتے ہیں۔

لیکن صدیقہ کے فن میں یہ کمی کھٹکتی ہے کہ اب بھی اس میں اکثر جذباتیت غالب نظر آتی ہے۔ کچھ ایسا لگتا ہے جیسے کہ وہ مظلوموں کے لیے ترس اور رحم کا جذبہ ابھارنا چاہتی ہیں۔ شبہ ہوتا ہے کہ گویا ان کے کرداروں میں اپنے حالات کو خود بدلنے کی طاقت نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ صدیقہ کے افسانوں کے کردار کبھی کبھی صرف آہ بھر کر یا کسمسا کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا احتجاج کوئی عملی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس طرح وہ سماجی قوتوں کے مثبت پہلو کو یا تو نظر انداز کر دیتی ہیں یا اُسے اتنے مدھم رنگوں میں پیش کرتی ہیں کہ وہ مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔

موضوع کے لحاظ سے دیکھئے تو صدیقہ کے افسانوں میں خاصہ تنوع ملے گا۔ اُنھوں نے تقریباً وقت کے ہر اہم مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے چنانچہ ان کے افسانوں میں جنگ اور امن، تقسیمِ ملک اور فسادات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل، فرقہ دارانہ منافرت، بے روزگاری، طبقہ داری جدوجہد کی شدت وغیرہ سبھی کے خاکے ملتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے ان تمام چیزوں کو عوام کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ان کے افسانوں میں ہمیں عام لوگوں کی آرزوئیں اور امیدیں، ولولے اور حوصلے، اُمنگیں اور ارادے جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً "یہ دھرتی کے بیٹے" میں کسانوں کی جدوجہد کا پرتو دکھائی دیتا ہے اور "اسکول ماسٹر"

ہیں اس نچلے متوسط طبقہ کی ایک حسین تصویر سامنے آتی ہے جو صدیوں سے آدرش واد کے سُندر سپنوں میں گم سُم رہ کر نہ صرف خود کو دھوکا دیتا رہا ہے بلکہ عوام کو خوابیدہ رکھنے میں وہ حکمراں طبقہ کا آلہ کار بنا رہا ہے۔ لیکن اب اس کی کایا پلٹ رہی ہے اور وہ خواب و خیال کی فضا میں پرواز کرنے کے بجائے ٹھوس زمین پر اپنے قدم جما رہا ہے۔

جہاں صدیقہ اونچے طبقہ کی عکاسی کرتی ہیں وہاں اس کی باہری ٹیپ ٹاپ کا بھرم کھول دیتی ہیں اور اس کے کھوکھلے پن، کورے پن اور گندگی کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ "ایک بیوی — ایک لوائف" اور "بے پالک" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ پہلے افسانے میں اس جاں طلب طبقے کی جھوٹی محبت کا اور دوسرے میں اس کی دکھاوٹی مروّت اور شرافت کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔

مگر ان افسانوں میں بعض جگہ صدیقہ اس اشارے سے بہک گئی ہیں اور انھوں نے حکمراں طبقہ کی شرمناک حرکتوں کو عوام سے منسوب کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر "گوتم کی سرزمین" میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کو عام انسانوں کی درندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس طرح ان رجعت پسند قوتوں کو بری الذمہ کر دیا گیا ہے جن کی ناپاک سازشوں کا یہ نتیجہ تھا۔

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے، صدیقہ ایک شگفتہ انداز بیان کی مالک ہیں۔ گو کہ اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ان کی زبان میں ملاحت اور بے ساختگی نمایاں ہے۔ ان کے الفاظ ہلکے پھلکے، سیدھے سادے اور گھر ملو روزمرہ کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں اپنے الفاظ

کے انتخاب میں کچھ زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ خود بخود موقع اور مقصد کے لحاظ سے آٹپکتے ہیں۔ وہ بعض اوقات مقامی محاورے بڑی بے تکلفی سے استعمال کر جاتی ہیں۔ لیکن وہ پس منظر کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ روانی اور اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

کردار نگاری میں صدیقہ اختصار سے کام لیتی ہیں۔ لیکن اس میں اتنی تفصیلات ضرور ہوتی ہیں کہ کردار کے وہ اہم خدوخال اُبھر آئیں جو کہانی کو معنی خیز بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

صدیقہ کے فن میں پختگی، گہرائی اور رچاؤ پیدا ہونے کا بہت موقع ہے۔ کیوں کہ اُنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو اس جدوجہد سے وابستہ کر دیا ہے جو ہمارے دیس کی جنتا آزادی، امن اور ترقی کے لئے کر رہی ہے جس قدر اس جدوجہد کو فروغ حاصل ہوگا۔ عوام کے شعور کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوتی جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ صدیقہ کے فن میں بھی نکھار پیدا ہوتا جائے گا۔

جامعہ نگر۔ دہلی   (ڈاکٹر) سلامت اللہ

۱۰ر جنوری ۱۹۵۲ء

ایک بیوی — ایک طوائف

یوں تو کوٹھی میں ہمیشہ ایک سناٹا سا رہتا تھا۔ ایسا سناٹا کہ اگر سوئی بھی گرے تو چھن سے آواز آئے۔ اور فرش کی صفائی بھی ایسی کہ باریک سے باریک چیز بھی نظر سے نہ چھپ سکے۔ اور اتنی بڑی کوٹھی میں زہرہ اکیلی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اس قدر گھبرا جاتی کہ اس کا جی چاہتا کہ اگر پر ہوں تو وہ یہاں سے اُڑ جائے۔ باوجود اس کے کہ جب وہ جمیل احمد کی بیوی ہو کر گھر میں داخل ہوئی تھی۔ وہ پردہ بھی چھوڑ چکی تھی۔ اور کبھی کبھار موٹر میں بیٹھ کر بازار بھی چلی جاتی تھی۔ یا بہت ہوا تو جمیل کے دوستوں میں سے کسی کے یہاں پارٹی میں ہی چلی گئی۔ ورنہ پھر یہیں کوٹھی میں پڑی رہے۔ اور کام بھی کچھ نہیں، جو کام ہی میں جی لگا رہے — کام کا معاملہ یہ تھا کہ کھانے پینے کا انتظام باورچی اور ایک نوکر کے سپرد

تھا. گھر کی صفائی کے لئے الگ نوکر لگے ہوئے تھے اور کپڑے بازار سے سِل کر آتے تھے. بس پھر کام بھی کون سارہ جاتا ہے. اور بال بچہ ابھی اس کے کوئی تھا نہیں - اس لئے کہ شادی کو ابھی تین چار مہینے ہوئے تھے. وہ کبھی کبھی جب بچہ کے متعلق سوچتی تو یہ خیال کر کے اس کا جی اُلجھ جاتا کہ اگر، بچہ بھی ہوا، تو آیا اُسے چھین لے گی - اس لئے کہ جمیل کے دوستوں کے یہاں وہ دیکھ چکی تھی، کہ بچوں کی پرورش بھی آیا ہی کرتی تھی. یہاں تک کہ ماں کو دودھ تک نہیں پلانا پڑتا تھا - اس کے لئے بھی ایک عورت ملازم تھی - اور یہی وجہ تھی کہ اتنے عیش و آرام کے بعد بھی وہ اُداس اُداس سی رہتی تھی. ایک تو اس زندگی کی وہ پہلے سے عادی بھی نہ تھی. اس کے سامنے تو وہی درمیانے طبقے کی زندگی تھی. جہاں ہر وقت وہ کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھی .. پھر جب کام سے جی اُلجھا. تو پڑوس میں کسی کے یہاں چلی گئی. اور لگے ہاتھوں اس کے کام میں بھی ہاتھ بٹا دیا. بھلا اتنا سا کسی کا کام کر دینے سے کوئی آدمی گھس تھوڑا ہی جاتا ہے. پڑوسن اگر اناج بناتی ہوتی، تو لے کر دو سوپ پھٹک دیئے. بچہ کا کپڑا سیتی ہوئی تو چار ٹانکے لگا دیئے - اور آپس میں تو یہ ہوتا ہی ہے. آدمی، آدمی کے کام آتا ہے - اور پھر کسی کا اس طرح کام کر دینے میں عیب بھی کیا ہے. اور اپنا جی بھی بہلا رہتا ہے. اور نہیں تو گھر میں کوئی آ ہی گئی. غریب غربا میں سے کوئی آ گیا مکان کے پیچھے اتنے چھوٹے کمرے تھے، جن میں ہر مذہب و ملت کے مزدور بسے ہوئے تھے، اب جو کوئی آ گئی. تو اس سے تھوڑی دیر بات

ہی کر لی اور پھر اپنے کام سے لگ گئی۔ لیکن یہاں کے تو ٹھاٹ ہی نرالے تھے۔ ایک تو بغیر اطلاع دیئے کسی کے یہاں جانا نہ چاہیئے۔ اور اگر وقت پہلے سے مقرر کر کے جانے کا پروگرام بھی بنا لیا، تو اس طرح کہ بہترین جوڑا پہن کر تین گھنٹے کے میک اپ کے بعد کوٹھی سے نکلنا چاہیئے۔ چاہے پاس والی کوٹھی ہی میں کیوں نہ جانا ہو۔۔۔ خادمہ آدھے گھنٹے بال سنوارے، اور کپڑے بدلائے۔ اور اس طرح پھر کوٹھی سے نکلا جائے، کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے، کہ کلکٹر صاحب کی بیگم آئی تھیں یوں ہی کپڑے پہنے ہوئے۔ اتنے پیسے والے کی بیگم اور ٹھیک سے کپڑے بھی نہ جڑ سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کا جی ایسی جگہوں کے جانے سے ہی الجھتا تھا۔ مگر جب جمیل ناراض ہوتے تو اس کو جانا ہی پڑتا۔ "ارے بیگم تم بھی کیا آدمی ہو۔۔ نعیم کی بیگم صاحبہ کتنی مرتبہ یاد کر چکی ہیں اور تم ہو کہ برابر ٹالے جا رہی ہو۔ کیا کہیں گی آخر وہ۔۔۔ ارے تم نہیں جانا چاہتی تو ایک روز ان کو ہی بلا لو اپنے یہاں چلئے پر۔ یا پھر چاہو تو ڈنر پر۔" اور وہ گھبرا جاتی اس لئے کہ بادی النظر میں تو یہ ایک مشورہ ہوتا، مگر ایسے ہی مشوروں کے ٹلنے پر تو اس کے اور جمیل صاحب کے درمیان کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنی طبیعت سے مجبور۔ ادھر اٹھارہ سال جس گھر میں پرورش پائی۔ وہاں کے طور طریقوں میں اور یہاں کے زمین و آسمان کا فرق تھا۔۔ اب اسی روز کی بات ہے۔ کہ نظیر خاں چپراسی کی بیوی آ گئی۔ بیگم صحن میں کرسی پر بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ اس کو بھی برابر کرسی پر بٹھا لیا۔ وہ بچاری کہتی رہ گئی۔۔ "بیگم! میں تو آپ کے پیر کی

خاک ہوں۔ تمہارے قدموں میں بیٹھ جاؤں گی۔" مگر سامنے کرسی خالی تھی اور وہ چونکہ آج بیگم سے ملنے آئی تھی۔ اس نے بھی اپنے بیاہ کا ریشمیں جوڑا پہن رکھا تھا۔ زہرہ نے یہی سوچا، کہ بچاری کے کپڑے خراب ہو جائیں گے اور اس کے آگے کرسی سرکا دی۔ "بیٹھو نا ہرج ہی کیا ہے، آخر تم بھی تو آدمی ہو، خواہ مخواہ فرش پر بیٹھ کر کپڑے خراب کرنے سے کیا فائدہ؟" اور وہ بچاری جھجکتے ہوئے ایک طرف کو بیٹھ گئی۔ وقت کی بات ہے جمیل صاحب کو نہ جانے کون سا کام تھا۔ وہ دندناتے ہوئے آ پہنچے۔ اور قطیر خاں چپراسی کی بیوی پر ان کی نظر پڑی۔ وہ نیک بخت ایک طرف کو ہو گئی۔ اور جمیل صاحب کو تو اسے دور ہی سے دیکھ کر شک ہوا تھا کہ کوئی ایسی ویسی ہی ہے۔ نوکری سے پوچھ بیٹھے۔ اُس بچاری کو کیا معلوم اس نے بھول پن سے بتا دیا، بس پھر گیا تھا۔ وہ شور مچایا، کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ وہ بچاری اپنا سا مُنہ لے کر الٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ اور بیگم کا یہ حال کہ اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ غصّہ بھی آیا، مگر کہتی تو کیا کہتی۔ البتہ اسی سوچ میں کئی رات نہ سو سکی۔ اور دل میں یہی سوچتی رہی۔ کہ کیسے بُرے دن آئے ہیں۔ ایک ماں کا گھر تھا، اور ایک یہ ہے کہ کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ پھر اس روز جمیل صاحب اس بات پر کتنا ناراض ہوئے تھے۔

"تمہاری طبیعت میں کس قدر چھوٹا پن ہے، کہ چپراسی کی بیوی سے باتیں کرنے لگیں، اور شریف شرفا سے دور بھاگتی ہو۔ کیا بیوی بلی ہے

کارٹون ---" اور پھر اس غصہ میں انہوں نے زہرہ سے کئی دن بات نہ کی۔ حالانکہ اس سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا۔ اس لئے کہ ویسے بھی کون بہت سی باتیں کرتے تھے --- ادھر نظیر خاں چپراسی کا یہ عالم اکہ کئی روز تک وہ صاحب سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ ان کے سامنے بس نظر جھکائے رہتا، اور اس کی بیوی نے جب اسے یہ واقعہ سُنایا۔ تو وہ اُلٹا اسی پر بگڑا، کہ --- "گئی تھیں روزے بخشوانے، اور نماز گلے میں ڈال لائیں --- تم سے کس نے کہا تھا، کہ تم کرسی پر چڑھ کر بیٹھ جانا --- اب دیکھو میری نوکری جاتی ہے یا رہتی ہے ---" اور نوکری کا نام سُن کر وہ بھی سہم گئی، اس لئے کہ وہ بچاری ابھی شادی ہو کر آئی تھی۔ عمر ہی کیا تھی، اور اسی نا سمجھی میں تو یہ چُوک ہو گئی۔ وہ روزانہ نفلیں پڑھتی کہ "پاک پروردگار! میرے خاوند کی نوکری قائم رکھنا۔ نہیں تو میں کہیں کی نہ رہوں گی ---" اور شاید اس کی دعا قبول ہو گئی۔ اس لئے کہ نظیر خاں کے ڈریس پہن کر جانے اور چپراس باندھنے کے معمول میں خدا کے فضل سے کوئی فرق نہ پڑا۔

مگر زہرہ کی اُداسی میں ہفتوں فرق نہ آیا۔ اور اس واقعہ کا اس کے کے دل پر اتنا اثر پڑا کہ نظیر خاں چپراسی کی بیوی کی بھولی بھالی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی --- "بیگم میں تمہارے پاؤں کی خاک ہوں" اُس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو جاتا۔ وہ کانپ جاتی۔ مگر نظیر خاں چپراسی کی بیوی اس کے سامنے یونہی پھرتی رہتی۔ اس واقعہ نے اس کے قلب پر ایک گہری اور انمٹ لکیر کھینچ دی تھی --- وہ سوچتی، کہ در اصل یہ

شادی ہی غلط ہوئی ہے۔ وہ اس گھر کے لائق ہی نہ تھی ــــ مگر پھر جمیل نے اس سے شادی کی ہی کیوں تھی، کیا اس کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طبقے میں پیغام دے رہے ہیں ـــــ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو جمیل کے گھرانے سے زیادہ نظیر خاں چپراسی کی بیوی سے قریب پاتی ـــ دراصل اس کی شادی کو بھی تین چار مہینے مشکل ہی سے ہوئے تھے۔ اور غالباً ان کے کلکٹر ہونے کو بھی اتنا ہی عرصہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ ادھر ان کا کلکٹری میں انتخاب ہوا۔ ادھر شادی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ بیٹھے انتظار ہی کر رہے تھے کہ جمیل صاحب کلکٹر ہوں، اور ان کے چہرے پر مقنع لٹکا دیا جائے۔ اور کوئی انتظار کرے یا نہ کرے البتہ زہرہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اسی لئے کنواری بیٹھی تھی۔ کہ جمیل صاحب کلکٹر ہوں اور وہ دلہن بن کر ان کے گھر میں داخل ہو ـــ اور ہوا بھی یہی نا ـــ زہرہ کے بھی کتنے پیغام آئے مگر ان کی ماں کو بھی کچھ ایسی ضد تھی، کہ بس آنکھ بند کر، منہ پھیر کے منع کر دیتی تھیں۔ "نا بی بی، مجھے تو زہرہ کا بیاہ ہی نہیں کرنا ہے" اور منع کرنے کی بھی دوسری بات تھی۔ وہ تو کچھ اس طرح کہتی، کہ سننے والیاں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتیں اور کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی، کہ اس کے سامنے منہ کھولے۔ بس اپنے گھر جا کر دل کی بھڑاس نکالتیں۔ "آخر ہمیں بھی تو دیکھنا ہے۔ کہ یہ بیگما زہرہ کے لئے کون سا تارا توڑ کر لاتی ہیں"۔

"اور ہاں کچھ عمر بھی ہو گی۔ میرے رشید کے ساتھ کی ہے۔ اور ماشاءاللہ رشید اب پچیسویں میں لگا ہے۔ خالی کے چاند سے"۔

"اور کیا اس کا بیاہ تو وہ جب کرے گی جب اس کا چونڈا سفید ہو جائے گا۔"

"اور ہاں دیکھو، پیام سلام سے دو بھاگتی ہے۔ آخر تم ہی کہو بہن جس کے گھر میں بیری ہوتی ہے، ڈھیلے آتے ہی ہیں۔ اللہ رکھے اپنی ننو ہی کو لو، ہر مہینے کہیں نہ کہیں سے بات چیت آتی ہی رہتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ زبردستی کا سودا تھوڑا ہی ہے۔ مت کرو۔ اور یوں تو لڑکی فقیر کی بھی کنواری نہیں بیٹھتی۔ مگر بات چیت کے طور طریقے ہوتے ہیں۔"

وہ سب اپنے دل کی بھڑاس نکال اپنے اپنے گھر کی راہ لیتیں۔

کہاں تو یہ عالم تھا اور کہاں اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اُدھر جمیل کا پیغام آیا، اِدھر چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ ایسی شادی اور ایسا بیاہ دور دور سننے میں نہیں آیا، اسی کو کہتے ہیں، کہ ہاتھ کی لکیر اور تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا۔ بس یوں سمجھو کہ ازل ہی سے زہرہ جمیل کے پلّے بندھ گئی تھی ورنہ اتنے پیغام آئے اور ٹکا سا جواب ——— یہ شادی کیا ہوئی، مچھلی کا شکار ہو گیا، کوئی تو گھنٹوں سے تاک لگائے بیٹھا ہے، اور کھٹکی کو ترستا ہے، شکار تو بڑی بات ہے، وہاں مچھلی منہ تک نہیں لگاتی اور یہاں جمیل کا یہ معاملہ، کہ اِدھر ڈوری ڈالی — اُدھر مچھلی کانٹے میں — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مچھلی بھی اسی ڈور کا انتظار کر رہی تھی۔

یوں تو زہرہ کسی رئیس گھرانے کی نہ تھی۔ بس یہ سمجھو کہ سارا گھر کسی نہ کسی طرح اس گرانی میں اپنی عزت سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا — ورنہ

گھر میں کیا خاک دھرا تھا۔ باپ ڈیڑھ سو روپے پنشن پاتے تھے ۔ بڑا بھائی ریلوے میں کہیں ملازم تھا۔ جہاں ہر وقت نوکری چھٹنے کی خبر رہتی تھی اور سارا گھر ہرن کی طرح خطرے کی اس گھنٹی کی طرف کان لگائے رہتا تھا کہ نہ جانے کب بُری خبر آجائے ـــ ان سب کے باوجود بھی زہرہ کے پیام ہمیشہ اچھے اچھے گھرانوں سے آتے رہتے تھے ۔ اور وجہ دراصل یہ تھی کہ اس کی صورت ہی کچھ ایسی تھی، کہ اس کے نام ہی پر پیغام آتے تھے۔ اس کی ماں کی بدمزاجی کے باوجود بھی اس کی صورت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی ـــ بڑے بڑے گھنگھریالے بال، دودھ سا رنگ، گول سا چہرہ، موتی جیسے دانت ـــ اور پھر جب وہ مسکراتی تو گالوں میں ایسا گڑھا پڑتا کہ پانی کی دو بوندیں آکر ٹھہریں ۔ آنکھوں میں سیاہ باریک ڈورے۔ پھر اس پر گھنی گھنی پلکیں، اور یہی وجہ ہے کہ بڑے گھرانوں کی یہی آرزو تھی، کہ زہرہ اُن کے گلدان میں آکر سج جائے۔ ورنہ ویسے تو وہ کوئی بہت پڑھی لکھی نہ تھی ـ بہت پڑھی لکھی سے میری مراد یہ ہے کہ اُس نے کوئی اسکول کالج کی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ وہ تو گھر کی چہار دیواری میں شرع کے اصولوں کے مطابق پل کر جوان ہوئی تھی، چھ برس کی عمر میں ملانی کے سپرد کی گئی جس نے بغدادی قاعدے سے لے کر کلام پاک تک پڑھا ڈالا۔ یوں تو اردو بھی اس نے خاصی پڑھ لی تھی، اور اردو کی بہترین تصانیف اس کی نظر سے گذر چکی تھیں "دیوانِ غالب" سے لے کر جوش کے "سنبل و سلاسل" تک اس نے بہت کچھ پڑھ لیا تھا، اور "قصہ چہار درویش" سے لے کر "ان داتا" تک اس کا مطالعہ پہنچ

چکا تھا۔ اور سب کچھ بڑے بھائی کی بدولت تھا۔ جو یہ سب کتابیں اسے ہر وقت مہیا ہو جاتی تھیں ـــــ اور جب سے وہ جمیل احمد سے بیاہی گئی۔ اس کا یہ مطالعہ اس سے چھوٹ گیا، اس لیے کہ اردو کی کتابوں کے پڑھنے سے انہیں ہلکی بغض تھا۔ اور بدقسمتی سے انگریزی اسے آتی نہ تھی ـــــ اسے موجودہ دور کی بیشتر انقلابی نظمیں یاد تھیں - ایک بار وہ جعفری کی نظم "فریب" گنگنا رہی تھی۔ تو اچانک جمیل صاحب نے سن لی۔ کیونکہ وہ اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے اور زہرہ کا خیال تھا کہ وہ چلے گئے ہیں ـــــ موٹر کی آواز سنائی دی، مگر وہ کوئی دوسرے صاحب تھے جو اٹھ کر گئے۔ اور جمیل میاں اپنے دفتر میں بیٹھے تھے، زہرہ کے گانے کی آواز سن کر چونک ہی تو پڑے اور خاص طور پر جب وہ اس بند پر پہنچی :-

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے

وہ سیدھے بیگم کے کمرے میں پہنچے۔ جو نہایت اطمینان سے مسہری پر الٹی پڑی ٹانگ اوپر نیچے مسہری پر مار رہی تھیں۔ اور گاتی جاتی تھیں، سر کے بال کھلے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اختر شیرانی کی جوگن کسی کمرے میں بند کر دی گئی اور وہ بار بار ایک مصرع گائے جا رہی تھی۔

ع :- باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

جمیل کھڑے سنتے رہے، اور اس ایک لمحہ میں ان کو اپنی بیگم فردوس

کی ایک حور معلوم ہوئی، مگر دوسرے لمحہ ہی انہوں نے لاحول پڑھی ــــ
لاحول ولا بیگم ــ یہ کیا غضب کر رہی ہو میری نوکری چھڑواؤ گی۔ یہ بھی
کوئی گانا ہے۔ اگر اس وقت کوئی سن لیتا، تو نوکری کے لالے پڑجاتے۔"
مگر وقت کی بات تھی، کہ یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ اور وہ چل دیئے۔ مگر
زہرہ کا کچھ نہ پوچھو کیا حال تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ــ شرم کے مارے
پانی پانی ہوگئی۔ اور اس لئے اور بھی وہ اس کوٹھی سے گھبرا گئی تھی، جہاں اس
کی رہی سہی آزادی بھی چھین گئی تھی۔

اب وہ اپنی مرضی سے ایک نظم بھی نہیں پڑھ سکتی تھی ــ ہاں تو یہ تھی
اس کی تعلیم، اور اس سے فارغ ہونے کے بعد اس کی ماں نے اسے سینے
پرونے کے کام پر لگا دیا۔ اور یہ تھی اس کی آخری کلاس ــ چنانچہ نکاح
کے بعد رخصتی ہوئی تو اس کے ماں باپ نے یہی سمجھا کہ لڑکی اپنے گھر بار کی
ہوگئی۔ ان کا جو فرض تھا وہ انہوں نے پورا کیا۔ اور اسی لئے زہرہ کی ماں نے
نکاح کے بعد ہی رونا دھونا بند کر کے شکرانہ کی نماز پڑھی، اور اپنے
پاک پروردگار کے سامنے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ "اے پاک پروردگار! ہمارا
جو فرض تھا، وہ ہم نے پورا کیا، ہم نے تیری امانت کو ہر طرح سے آرام
سے رکھا، اور اب تیرے حکم کے بموجب اس کو دوسرے کے سپرد کر دیا
تو اس کی دیکھ بھال کرنا ــــ" جا نماز پر بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں
آنسو بھر آئے۔ مگر پھر وہ دوپٹہ سے پونچھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور زہرہ اپنے
گھر بار کی ہوگئی ــ ماں باپ، بھائی خوش تھے کہ چلو اچھا گھر بار ملا ہے

سدا عیش کرے گی اور یہی وہ اطمینان تھا کہ بیٹی بیاہنے پر بھی ان کے دماغ پر گرانی نہ محسوس ہوئی۔ حالانکہ ساری برادری والیاں کہہ رہی تھیں کہ "شاباش! ایسی ماں کو کہ بیٹی بیاہنے پر آنکھ میں پانی نہ لا سکی۔۔۔ بیٹی کی پالکی نہیں نکلتی، جنازہ نکلتا ہے" اور سچ بات ہے، کون سوچ سکتا ہے کہ یہ بیاہ نہیں تھا، زہرہ کی جیتی جاگتی لاش تھی، جو جمیل کے گھر پہنچا دی گئی۔

جمیل کے گھر والے سازو سامان دیکھنے میں مشغول ہو گئے، کہ لڑکی کیا لائی ہے۔ اور بات بھی سچی ہے کہ انھیں حق تھا، کیونکہ لڑکا صاحب ثروت تھا۔ اگر معمولی نوکری پر ہوتا تو لڑکی کی شکل دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ اور پاک پروردگار کا شکر بجالاتے کہ اس نے ایسی قبول صورت بہو دی ہے۔ پھر طور طریقہ کی اچھی، گھر بار چلائے گی، اولاد ہو گی تو باپ دادا کا نام عزت سے چلے گا، مگر وہاں چونکہ لڑکا کلکٹر تھا، اس لئے شکل وصورت، طور طریقہ ہی کہاں کافی ہوتا۔ سوال تو یہ تھا کہ جہیز کیا کیا لائی ہے۔ چنانچہ جب جہیز آنگن میں رکھا گیا، تو سب میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ بھلا ایسے بھی کوئی لڑکی بیاہتا ہے، کہ اٹھا کے یوں ڈال دیا۔ یہ بھی کوئی جہیز میں جہیز ہے۔ اور پھر زیور کا دیکھنا تھا، کہ سب نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ "اجی ہوگا کوئی پندرہ تولے۔۔۔ لے کر ننگی بوچی لڑکی ڈال دی جیسے کوئی بالٹی سے پانی انڈیلتا ہو۔"

"ہمارا لڑکا دیکھو کہ بس دیکھتے ہی بنے۔ ۔ پھر نوکری بھی ایسی افسری کی کہ بیگم تمام عمر مسہری پر بیٹھ کر کھائیں گی ۔۔۔ مانا کہ شکل وصورت اچھی ہے پر بہن کوئی خالی صورت سے کر جائے گا کیا؟" ۔۔۔۔ یہ تھیں سسرال والوں

کی باتیں. جو شادی بیاہ کے بعد ہمیشہ ہی سننے میں آتی ہیں۔ اگر لڑکی سامان سے گھر بھی بھر دے، تو بھی لڑکے والے کہنے سے رہتے کہ ہماری حسرت نکل گئی۔ بہت شریف ہوئے تو بس یہی، کہ چلو جتنا بھی ہے اچھا ہے، ہمیں لڑکی مل گئی۔ یہی بہت ہے۔"

ہاں مگر زہرہ کے لئے جو چیز اہمیت رکھتی تھی، وہ تھی جمیل کی شخصیت۔ شادی کے پہلے اس کے دل میں تمام حسرتیں اور تمنائیں تھیں، جو ایک نوجوان لڑکی کے دل میں رہا کرتی ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں ایک خوبصورت ہیولیٰ بنائے ہوئے تھی۔ اور پھر سیتا کی طرح اس کے گلے میں ڈال کر تنہائی میں آپ ہی آپ شرماتی۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں اپنی خواب آلود آنکھیں ڈال دیتی۔ وہ اسے اپنے بازو کا سہارا دیتا۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا کہ وہ کسی گہری نیند میں سرمست ہے۔ اور وہ اس کے شانوں پر اپنا سر رکھ کر سو جاتی — گہری نیند۔ اور پھر اس کو دنیا و مافیہا کی کچھ بھی خبر نہ ہوتی۔ اُس وقت اس کے گھنے گھنگھریالے سیاہ بال کسی آن جانے آغوش میں بکھرے ہوئے ہوتے۔ پھر جیسے وہ چونک پڑتی۔ کسی نے اس کو جیسے کسی طویل اور نہ ختم ہونے والی نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اور یہ آواز ہوتی جمیل میاں کی — جب وہ اپنے کسی نوکر کو آواز دیتے۔

"دیکھو آج ڈائننگ ہال میں کرسیوں کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اور ہال کمرے میں تیس کرسیاں ہونی چاہیئں — اور ڈائس کے لئے تخت لگا کر قالین بچھا دینا — آج ناچ پارٹی کا بندوبست ہے۔"

اور یہ کہنے میں وہ ذرہ برابر نہ جھجکتے ـــــ پھر زہرہ کے جسم پر تار جھنجھنائے ہوئے معلوم ہوتے اور اس کے خواب چکنا چور ہو جاتے ـــــ آج پھر آئی ہوگی کوئی کلموہی ـــــ پھر اس کے بعد وہ رات کی بے پناہ تنہائی سے گھبرانے لگتی۔ اس کا بھیانک تصور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ وہ مسہری پر بیٹھی ہی رہ جاتی اور تکیئے کو دبا دبا کر جیسے کسی سے انتقام لیتی ہو ـــــ یہی نہیں، رات کو جب ناچ گانے کی آواز آتی تو یہ نغمے اس کے جسم پر مسلسل کچوکے لگاتے۔ وہ گھبرا کر کمرے میں ٹہلنے لگتی دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیتی۔ مگر وہ آواز اس کے کانوں میں گھستی ہی چلی جاتی۔ اور پھر زہرہ شکست کھا کر مسہری پر دھڑام سے گر پڑتی۔ پھر ـــــ وہی موسیقی کی فلک شگاف تانیں، شراب کی بوتلیں ـــــ اور اس کے خاک بھی سمجھ میں نہ آتا، کہ کیا کرے۔ وہ اس طرح رات بھر پڑی رہتی جیسے اس کے پاس والی دوسری مسہری پر کوئی لاش پڑی ہوئی ہے، اور سفید کپڑا ڈھکا ہوا ہے ـــــ وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتی۔ مگر بے بس ہوتی۔ وہ رات خوفناک رات اس کی راتوں میں اکثر ڈاکوؤں کی طرح دیدہ دلیری سے گھس آتی، اور وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی۔

ایسی ہی بھیگی راتیں ہوتیں۔ جو اس کی زندگی میں کچھ سہانی ہوتیں، مگر اس رات وہ زہرہ نہ جانے کن پردوں میں چھپ جاتی اور اس کا جسم وہی رہتا۔ گورا چٹا سڈول جسم ـــــ لیکن اس وقت وہ کوئی بیسوا ہو جاتی، اور اس کو ایسا محسوس ہوتا، کہ جیسے اس کی مرضی کے خلاف کوئی

اس کے جسم پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ مگر وہ مجبور ہوتی۔ اس لئے کہ وہ مستقل طور پر خریدی ہوئی تھی۔ جس کو دونوں وقت بہترین کھانا ملتا تھا۔ بہترین کپڑے ملتے تھے ــ اور وہ جمیل کی ایسی ہی خالی راتوں کو آباد کرتی، اور وہ رات بھی یوں ہی گذر جاتی ـ وہ کیف آور تصور فضا کے نامعلوم خلا میں پرواز کر جاتا۔

جمیل جب کبھی اس سے باتیں کرتا، تو مسکرا کر یہ کہتا :۔

"زہرہ! تم خودرو پودا ہو، افسوس کہ کسی مالی نے تمہاری آب یاری نہیں کی۔ تم کو بس موسموں کے سرد و گرم نے پروان چڑھایا ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ حسین پھولوں کی کیاریوں کے گرد جب حسین چھوٹی چھوٹی شاہراہیں تراشی جاتی ہیں۔ تو وہ پھول کس قدر حسین معلوم ہوتے ہیں "

زہرہ معصومیت سے کہتی کہ میں نہیں سمجھتی آپ کی بات "

اور وہ غصہ سے جواب دیتا۔" تم کبھی نہیں سمجھو گی میری بات، جاہل کہیں کی:" پھر وہ جھنجھلا کر اپنے آفس کی طرف چل دیتا، کاغذوں پر دستخط کرنے لگتا۔ اور بار بار اپنے قلم کو اپنے دانتوں میں دباتا ـــ شاید اس کو اس امر کا افسوس ہوتا کہ اتنا بڑا افسر ہو کر وہ صرف ایک کاغذ پر دستخط نہیں کرسکتا ـــ پھر وہ بدستور اپنے کاغذوں پر فراٹے سے دستخط کرنا شروع کر دیتا۔ لیکن زہرہ کے لئے زندگی کا پھر وہی بے پناہ سلسلہ شروع ہو جاتا جس کا کوئی اور چھور نہ ہوتا۔

اَندھیارے کے سپنے

بھارتی آہستہ آہستہ جھونپڑے میں داخل ہوئی، اس کے قدموں کی چاپ، جیسے دھرتی اس کو اپنے چرنوں میں سمیٹ رہی ہو! اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس میں برف کا سا جمود تھا اور تنہائی جیسی خاموشی۔ شام ہو چکی تھی، سورج افق کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن اندھیارا اس کے ڈوبنے سے پہلے ہی بھارتی کی جھونپڑی میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ تاریکی تو اس کے گھر میں سدا ہی سے ہے۔ جب سورج دیوتا اپنی روشن کرنوں سے سیاہی کو دھونا چاہتے ہیں تو سیاہی بہہ کر انھیں گھروں میں پناہ لیتی ہے، بھارتی کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں جس کی قوت پر اتنی ناامیدیوں کے بعد بھی اس کو بھروسہ تھا۔ کاش وہ کچھ دیر کے لیے اس ڈوبتے ہوئے دیوتا کو اپنی نگاہوں سے سہارا دے سکتی تاکہ وہ اس اندھیارے کے مقابلے

کی سکت پیدا کر سکے — یہ سورج تو آکاش کے قبضے میں ہے، وہ تیل ہی جو دھرتی کی کوکھ سے نکلتا ہے اس کو نہیں مل سکتا — سورج پوچھتا ہے۔ "کون ہے جو میری جگہ لے گا؟" ساری کائنات بھائیں بھائیں کرنے لگتی ہے۔ آکاش خون کا پھاگ کھیل رہا ہے۔ دھرتی پر سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں —" ہاں — کون ہے جو میری جگہ لے گا" دیوتا گرج کر پوچھتا ہے مٹی کا دیا خاموش نہیں رہ سکا، شاید اس میں کچھ تیل باقی ہے" میں کوشش کروں گا" وہ کہتا ہے اور اب سورج کو اطمینان ہے۔ وہ رات کی گود میں شانتی سے اندھیارے کے سپنے دیکھے گا — اور جیسے وہ دیا جو تھوڑی سی بساط پر اپنی لو اونچی کئے تھا جیت گیا — یہ دیا سورج کی طرح اندھیارے سے ہارتا نہیں۔ یہ رات بھر روشنی کے سپنے دیکھتا ہے۔ دیا بھی اندھیارے کی آس ہی تو ہے — بھارتی مٹی کا دیا ٹٹول رہی تھی۔ جو اس وقت نہ جانے کتنے اندھیارے اپنی گود میں چھپائے تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا — چراغ کی لو اندھیارے کی نذر ہو چلی تھی، کئی دن سے وہ پوجا بھی تو نہ کر سکی تھی، اس کی آشائیں مدھم پڑ چکی تھیں اور کیسے نہ پڑتیں جب تیل ہی نہیں تو دیا کیسے جلے، وہ پوجا کیسے کرے، نہیں وہ اندھیارے کے آگے سر نہیں جھکا سکتی — ہر طرف سیاہی ہی سیاہی، پرہول تاریکی سیاہی ہی سیاہی، گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

"بابا" — اس نے بچے کو پکارا جیسے دور کہیں اندھیارے میں کوئی روشنی دکھائی دے، بھارتی کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ بابا کے پاس پہنچی۔

بابا — اب کبھار کیسا ہے، اس نے اندھیرے میں ہات بڑھایا جو بچے کی گرم گرم پیشانی سے جاکر ٹکرایا اور پھر ساکت ہوگیا۔

"ماتا — ؟" بابا کی ہلکی آواز فضا میں تھرّائی۔

"ہاں — تیری بھارتی ماتا —"

"ماتا —" اس نے دوبار کوشش کرتے ہوئے کہا اور اندھیرے میں ہات چلایا جو اس کے اور ماتا کے درمیان دھوئیں کی طرح حائل تھا اور اپنی ماں کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ یہ اندھیرا دیکھنے بھی دے اور نا امید ہوکر آنکھیں بند کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "ماتا یہ اندھیرا نہیں دیکھا جاتا"

"میرے لال —" کتنی قوت آگئی تھی ماںتا کے ان دولفظوں میں۔ گویا وہ اپنے لال کے لئے بجھے ہوئے سورج کی تمام شعاعیں ہی نو اکٹھا کردے گی۔

"ماتا — کتنی رات ہوگئی" وہ اندھیرے سے گھبرا رہا تھا۔

"ابھی رات کہاں بیٹا — کھولی کے باہر دیکھ اجالا ہی اجالا ہے"

"پر — ماتا — کس کام کا وہ اُجالا جو کھولی کے باہر ہی رہے" اور وہ نا امید ہوکر چپ ہوگیا۔ جب اس کی اپنی کٹیا میں اجالا نہیں تو پھر چاہے ساری دھرتی پر اجالا ہی اُجالا ہو اس کے لئے تو یہ ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں — پر، ماتا کی آنکھیں نہ جانے اس کو دیکھ بھی سکیں ؟

بٹیا — ابھی تو بہت سمے ہے۔ آکاش کی لالی ہماری مدد کرے گی۔ اپنی کھولی میں بھی اجالا ہو ہی جائے گا — میں تیل لاتی ہوں — دیکھ آج سے یہ جیوتی کیسی جگتی ہے۔" بھارتی کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا ہڈیاں ایک دوسرے سے پیوست ہو گئیں، اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے جسم میں بھگوان جانے اتنی شکتی کہاں سے آگئی تھی۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ دھرتی ماتا کوئی تیل تھوڑا ہی اگلے گی — یہ کیسی ماتا ہے جس میں ماتا نہیں —

بھارتی چل پڑی — ناامیدیاں اس کا تعاقب کر رہی تھیں، وہ ان کو بھولنا چاہتی تھی۔ پر آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی ان مٹتی ہوئی آشاؤں کے ساتھ ڈوبی جا رہی ہے۔ کنول کی گود میں جیسے پانی کا قطرہ آکر جم گیا اور اس نے دونوں پٹ بھینچ کر اس کو گرا دیا — سیٹھ جی سے بوتل بھی تو لینی ہے۔ کہیں ٹکی بند نہ ہو جائے — اندھیارا بڑھتا جا رہا تھا، اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے، نظریں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے برگد کے گھنے پیڑ کے پیچھے غائب ہو گیا۔ بھارتی اس کی لالی کو تکتی رہ گئی۔ جیسے سانپ نکل گیا وہ لکیر پیٹتی رہ گئی۔ اس نے نظریں جھکا لیں پھر بھی نہ جانے کون سی آرزو تھی جو اس کو اندھیارے سے لڑنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ بٹیا بیمار ہے۔ تن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں — لیکن روشنی کی تمنا اس کی ہر خواہش پر حاوی تھی۔

سیٹھ کا مکان آگیا۔ وہ اندر چلی گئی، ہر طرف اجالا ہی اجالا تھا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس اُجالے میں اس کا دم گھٹنے لگا، روشنی کی خواہش مدھم چراغ کی لَو بن گئی۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈنے لگیں۔

"بیٹیا — ذرا — بوتل تو دے دے" اس نے سیٹھ کی لڑکی سے کہا اور اس کی نظریں "اسٹوو" کے ہلکے نیلے اور ہرے شعلوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

"بیٹیا — یہ کیا ہے؟"

"یہ انگریزی چولھا ہے — اس میں مٹی کا تیل جلتا ہے"

"مٹی کا تیل —" بھارتی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دھرتی سے تیل اب بھی نکلتا ہے، وہ بانجھ نہیں ہوئی — لیکن اس کی ممتا اپنے بیٹوں میں سگے سوتیلے کا امتیاز کرتی ہے شاید۔

"لو — یہ بوتل، تیل لینے جا رہی ہو"۔

"ہاں —" وہ اس سے آگے نہ بول سکی، اس کی آنکھیں اس بدیسی چولھے کے شعلوں کی طرح جل رہی تھیں، وہ خاموشی سے بوتل اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کا عزم اُداسی میں بدل چکا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ابھی کتنی دور جانا ہے۔ بابا کا نہ جانے کیا حال ہو — بھگوان تو اس کی رکھشا کر — وہ پھر فضا کے بے رنگ خلا اور دھرتی کے اندھیارے میں آکاش کی لالی ڈھونڈنے لگی۔ اس کا جیون آشاؤں سے بھرپور ہے، وہ آشائیں جو کبھی پوری نہیں ہوتیں — انھوں

نے ہمیشہ ہی تو اس کو نراس کیا ہے۔ لیکن اس نے کبھی بھی ان کی پرواہ نہ کی ہو۔ سداساگر کے دھارے میں بہتی رہی۔ جو بھی دھارا آیا اس کو اپنی طرف بہا کر لے گیا، بھارتی کا سارا جیون انھیں لہروں میں لپٹا ہوا تھا —— پھر بھی وہ نراس نہ تھی —— ایک دن اس کا بیٹا اچھا ہو کر، اجیالے کے درشن کرے گا —— اس کی کٹیا آکاش کی لالی کی طرح سرخ ہو جائے گی، وہ محنت مزدوری کر کے اپنے لال کے جیون کو اُجیالے سے بھر دے گی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جیسے جیون کے سپنے سدا سچے ہی تو ہوتے ہیں، اس کی نگاہوں کے سامنے انگریزی چوٹھا جل رہا تھا۔ جس میں لَو نکل رہی تھی، پر دھواں غائب تھا —— تیل کی ٹنکی قریب آ گئی۔ کتنی عورتیں اور بچے اپنی اپنی بوتلیں لٹکائے کھڑے تھے ٹنکی کا پالش کیا ہوا سرا چودھویں کے چاند کی طرح سیاہی میں چمک رہا تھا جس کے اِردگرد تارے شمار ہے تھے۔ وہ تارے جو تاریکی میں بھی اجیالے کی آس بندھاتے رہتے ہیں، بھارتی کا ذہن بیکار ہو گیا۔ وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ قدم آپ ہی آپ منزل کی طرف اُٹھ رہے تھے۔

"ہائے بھگوان —— کتنی بھیڑ ہے اور کتنا اندھیرا" ایک عورت نے کہا۔

"اب سمے نہیں رہا۔ بابو نے بتی بند کر دیا۔"

"اب کل ملے گا۔"

"کل ملے گا۔" بھارتی چونک پڑی۔ جیسے چلتے چلتے اس کا سر کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ اس کی نظریں چودھویں کے چاند کو تک رہی تھیں جو

اب بھی اسی طرح چمک رہا تھا۔

"دوپہر سے کھڑے کھڑے گوڈ بھی ٹوٹ گئے۔ اب تو گھر جانے کی تاکت نہیں۔" ایک بوڑھی عورت بولی۔ جو زندگی کی تقریباً ستر منزلیں انھیں دُکھ اور مصیبتوں کے درمیان طے کر چکی تھی۔

"اب کیا ہوگا — دیا کیسے جلے گا۔" بھارتی کی آواز بیٹھی جا رہی تھی وہ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح بوتل لئے کھڑی رہی اس کو کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ تیل ملے گا بھی کہ نہیں۔ کبھی سب کے سب لائن میں آس لگا کر کھڑے ہو جاتے — شاید بابو کو ان کی حالت پر کچھ رحم آجائے۔ پر جب معلوم ہوا کہ بابو کو سینما کے لئے دیر ہو رہی ہے وہ آج تیل نہ دے گا تو سب کی آشائیں ٹوٹ گئیں — وہ اپنی خالی بوتلوں کو مایوس نظروں سے دیکھنے لگے۔

بھوک سے ننھے بچوں کی چیخ پکار نے فضا میں ایک عجیب ہیبت ناک کیفیت پیدا کر دی تھی۔ یہ بچے دیر تک اسی طرح روتے رہے۔ چندا ماموں کو دیکھ کر بھی تو چپ نہ ہوتے اس لئے کہ چندا ماموں دور تھے اور ان کے خالی پیٹ کھیر سے نہ بھر سکتے تھے۔

"اب کس بکھت گھر پہنچیں گے اور کب پکانا ریندھنا ہوگا، ہمرا گاؤں بھی تو کئی کوس ہے۔ بچے نے رو رو کر اتنگ ہلکان کر دیا ہے۔"

"ہاں بائی — دوپہر کا کھائے تھے۔ اب یہ بکھت آ گیا ہے۔ آکھر کہاں تک برداست کرتے۔"

"اب کل پھر آنا ہوگا — اس لڑائی نے تو ہم گریبوں کا جیون بالکل

ہی اجیرن کر دیا۔"

"اری بہن ــــ تیل تو تیل، پہننے کو کپڑا تک نہیں ملتا، آکھر کوئی ننگا بھی کیسے پھرے؟" ایک عورت بولی جس کی پھٹی ہوئی دھوتی سے چاند کی کرنیں سرایت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مگر بھارتی ــــ اس کو تو صرف تیل چاہیئے تھا، وہ اس سے اپنی کٹیا میں چراغ جلائے گی۔

"میرا بیٹا ــــ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ماتا کی آواز سنانے کی نہیں ہوتی۔ اس میں شعاعوں کی سی تڑپ اور دیپک جیسی لپک ہوتی ہے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اب بھیڑ چھٹ گئی۔ جیسے چیونٹیاں رینگتے رینگتے بلوں میں گھس گئی ہوں۔ بھارتی نے اپنی خالی بوتل کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی نظریں چمکتے ہوئے چاند پر جم گئیں۔ کاش وہ اس کی کرنوں کو اپنی بوتل میں انڈیل دے ــــ

"چلو بائی! رامو ٹیلی کے پاس والے سیٹھ کی دکان پر دیکھیں۔ شاید وہاں مل جائے۔ ایک نے رائے دی۔

"وہ دے دے گا؟"

"دو چار آنے جیادہ ہی لے گا اور کیا ــــ پر تیل تو مل جائے گا؟"

بھارتی کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا جو بادلوں میں سرکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ بابا کا نہ جانے کیا حال ہو گا ــــ اس نے اپنے دھول میں اٹے ہوئے پیروں کی طرف دیکھا۔ وہ کس قدر تھک

گئی تھی۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ بادل گھر کر آرہے ہیں۔ چاند بھی اپنی کرنیں سمیٹنے والا ہے۔ اس نے پھر آکاش کی طرف دیکھا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ پھر اس کی نظریں ان تاروں پر پڑیں جو آسمان پر کہیں کہیں بکھرے ہوئے تھے — چاند چھپ بھی جائے تو کیا یہ تارے تو دھرتی ماتا کو کالی ناگن سے بچا ہی لیں گے۔ وہ اپنے خیالوں میں کتنی دور نکل گئی۔ سیٹھ کی دکان نہ جانے کہاں ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ اس کا جیون بھی کیسا ہے۔ کبھی تو آشائیں خود بخود آجاتی ہیں اور کبھی اس کو پھر نراس کر دیتی ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، رنگ برنگ قمقمے، دیواروں کے ہرے، لال، پیلے بیل بوٹے اس کی تخیئلی آنکھوں میں گھوم گئے۔ پھر ذرا سی دیر میں سیٹھ کی دکان مل گئی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ چاند بادلوں سے نکل آیا تھا۔ دھرتی پر چاندنی ہی چاندنی بکھری پڑی تھی۔ آکاش کے تارے مدھم پڑ گئے

"سیٹھ جی — تھوڑا تیل ہوگا۔"

"کیا تیل؟" — سیٹھ جی کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"مٹی کا تیل —" بھارتی سراپا عاجزی بن گئی۔ "سیٹھ جی میری کٹیا میں اندھیرا پڑا ہے۔"

"پڑا ہوگا — تو میں کیا کروں۔ چل یہاں سے تیل ویل نہیں ہے۔ دکان بند کرتے سمے کون تیل دے گا۔" سیٹھ نے اُجالے کی بھکارن کو ٹھکرا دیا۔

"تھوڑا سا سیٹھ جی —" وہ کہنا چاہتی تھی پر کہہ نہ سکی۔

"دور ہو یہاں سے۔" سیٹھ گرجا اور غصّہ سے اس کی توند زیر و زبر

ہونے لگی۔

بھارنی کی بوتل گرتے گرتے بچی، اس کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی۔ بادل کے دوسرے ٹکڑے نے آکر چاند کو اپنے تاریک دامن میں چھپا لیا تھا ــــ اب کیا ہوگا؟ وہ بیٹے کو کیا جواب دے گی۔ اس نے وعدہ کیا تھا، وہ عہد کرکے نکلی تھی، پر اب خالی بوتل لئے جا رہی تھی، بھگوان جانے اس کا کیا حال ہو ــــ سیٹھ کی بوتل بھی تو واپس کرنی ہے، بچارے کتنا خیال کرتے ہیں، اب دیکھو بوتل ہی دے دی ــــ پر کس کام کی وہ بوتل جو ایک دیئے کی پیاس نہ بجھا سکتی ہو ــــ وہ کوٹھی کی طرف چل دی۔ اس کی آنکھیں دور ستاروں میں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں، بادلوں سے سیاہی دور ہو چکی تھی، وہ پربت کی شکل بنائے آکاش پر چڑھے آرہے تھے۔

بھارنی کی نظریں آکاش پر ہمالہ کی چوٹیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس کو خیال آیا کہ سیٹھ جی کی لڑکی سے تو ذرا مانگ کر دیکھے: "بچاری بڑی سیدھی ہے ــــ وہ ضرور دے دے گی"۔ پھر تارے اس کی آنکھوں میں ٹمٹمانے لگے۔ جو کبھی بجھ جاتے اور کبھی چمک اٹھتے۔ اس کے قدم تیز ہو گئے۔ اسٹوو کے نیلے اور ہرے شعلوں کی لپک اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اندھیارے میں آشاؤں کے سپنے دیکھتی ہوئی وہ کوٹھی میں داخل ہوئی، بجلی کی تیز روشنی، اُجالا ہی اُجالا ہے ــــ اور پھر اس اجیالے سے وہ گھبرانے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا، جی چاہا واپس چلی جائے۔ کیا فائدہ کہنے سے۔ اس سمے کون مدد کرتا ہے ــــ اس کی امیدیں پھر ٹوٹ

رہی تھیں۔

"کیوں تیل مل گیا" سیٹھ کی لڑکی نے پوچھا۔

بھارتی کچھ کہنا چاہتی تھی پر نہ کہہ سکی۔ اس کے الفاظ گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ اس نے خاموشی سے بوتل آگے بڑھا دی۔

"اچھا ـــ تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں تھوڑا سا لاتی ہوں۔ لیکن کسی کو پتہ نہ چلے۔" لڑکی بوتل لے کر اندر چلی گئی۔

بھارتی کو تیل مل گیا ـــ وہ کس قدر خوش تھی، جیسے جیون کی بازی جیت لی ہو۔ جیسے اندھیارا ہار گیا ہو۔ اس نے غور سے دیکھا اور ایسا محسوس کیا جیسے کتنے ہی چاند، سورج اور ستاروں کا اُجالا اس میں بند ہے ـــ اس کے گھر میں دیپک جل اُٹھے۔ سیٹھ کی کوٹھی کی طرح اس کی کٹیا بھی روشن ہو گئی۔ اور اندھیارا دور کہیں بن باسی ہو گیا ـــ اُف کتنی رات ہو گئی۔ سورج کب کا سورگباش ہو گیا۔ بابا نہ جانے کیسا ہو گا ـــ وہ جاتے ہی کہے گی۔

"بیٹا ـــ دیکھ میں تیرے لئے کتنے اجیالے لائی ہوں"۔

وہ دوڑنے لگی۔ بیٹا بیمار ہے۔ اندھیرے میں پڑا ہے اس کی راہ تکتے تکتے نراس ہو گیا ہو گا ـــ وہ آگے نہ سوچ سکی۔ چاند اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اجیالا اس کے ہمراہ تھا۔ کہیں میرا بیٹا راہ تکتے تکتے نراس نہ ہو گیا ہو اس کا ذہن پھر چونکا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ اندھیارے سے ہار نہیں سکتا۔ اس کا جی گھبرانے لگا۔ کاش اس کے پر ہوتے تو وہ اڑ کر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جاتی اور دیا جلادیتی
وہ چونک پڑی، اس کے قدم رُک گئے۔ اس نے آج بھی پوجا نہیں کی۔۔۔ وہ سیٹھ کے یہاں کر سکتی تھی۔ پر وہ بھول گئی۔ بیٹا بیمار ہے۔ پیٹ کی آنچ سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ اس کو غصّہ آنے لگا۔ اس نے پاپ کیا ہے۔

بھارتی اپنی کٹیا کے قریب پہنچ گئی۔ چاند سامنے والی کوٹھی کی آڑ میں چھپ گیا۔ اس کی کٹیا پر کوٹھی کا سایہ کالے کالے دیو کی مانند بڑھتا دکھائی دیا۔ رات کے بڑھتے اندھیرے میں وہ روشنی کی بجھی ہوئی شمع لئے جارہی تھی۔ جو جلاتے ہی جل اٹھے گی۔

"بیٹا ۔۔۔"

اس نے دروازہ ہی سے آواز دی۔ پر کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر آواز دی۔ اور دور کسی کونے سے ایک جھینگر نے اس آواز کا کرخت جواب دیا۔ بھارتی کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہات کانپ گیا۔ اس نے جلدی سے بوتل کو زمین پر رکھنا چاہا۔ لیکن جیسے دھرتی کہیں غائب ہوگئی ہو بوتل کسی سخت چیز سے ٹکرائی ۔۔۔ چھن ۔۔۔ ن ۔۔۔ ن ۔۔۔ اندھیارے سے اجیالا ٹکرا کر چوا چور ہوگیا۔

عمل — اور — رَدِّ عمل

شاہینہ کی نظریں باربار اِدھراُدھر پڑ رہی تھیں —— یہ فضائی آوازیں۔ وہ تو ہرنی کی طرح چونک پڑتی تھی، جہاں کوئی آواز آئی اور اس کے کان اُدھر لگے۔ اللہ جانے کون ہے وہ گھبرا رہی تھی، وہ ہرنی تو تھی ہی مگر جیسے وہ کوئی چور بھی تو ہے۔ جس نے بڑا جرم کیا ہو اور خوف و ہراس کے ملے جُلے اثرات اس کی آنکھوں کی درازوں سے جھانک رہے تھے، وہ خواہ مخواہ یہاں چلی آئی بھلا یہ نہر بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے، پانی کا ایک نالہ ہی تو ہے. ہلکے ہلکے بہہ رہا ہے —— "نہیں" شاہینہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اور اس کے ادا کرنے میں وہ یہ بھی تو بھول گئی کہ کیا سوچ رہی تھی، ہو گی کوئی بات اور بے سمجھے بوجھے اس نے اپنی نگاہیں چاند پر ڈال دیں جو نہر کے اندر جھول رہا تھا اور وہ اس

داغ کو تلاش کرنے لگی جس نے، کہتے ہیں کہ چاند کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔
اور پھولی پھولی شفق کے گالے جو بڑھتے ہوئے اندھیرے کو سورج کا آخری پیغام پہنچا رہے تھے ۔۔۔ شاہینہ نے نہر کی گہرائی میں اپنی نظریں گاڑ دیں۔ وہ نہر جس کے اندر پورا آسمان سما گیا تھا، تاروں کی قندیلیں دیوالی کے چراغوں کی طرح ایک اِک کر کے جلنے لگی تھیں۔ جو پانی سے بھی تو نہ بجھتی تھیں ۔۔۔ اور آہستہ آہستہ اس نے اپنی نگاہیں نہر کی گہرائی سے آسمان کی بلندی پر اٹھائیں یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تارے کہیں پانی میں تو نہیں گر گئے ۔۔۔ مگر وہ تو سب کے سب آسمان پر بری طرح ٹنک رہے تھے۔

"آپا چلو بھی نا" کتنی دیر ہو گئی اور اختر نے ایک ڈھیلا پانی کی سطح پر پھینکا تارے لرز گئے وہ ساری جان سے کانپ ہی تو گئی۔ وہ ڈری کہ کہیں یہ بکھر نہ جائیں مگر وہ خاموش پانی حلقے بنانے لگا۔ خوبصورت گول حلقے اور چاند کے ساتھ تارے بھی جھولنے لگے۔ شاہینہ کے جی میں آیا کہ وہ پانی میں کود پڑے۔ اور پانی میں بکھرے ہوئے ان تاروں کو سمیٹ لائے۔ مگر پھر فوراً اس کو یاد آیا کہ وہ نہ جانے کیا بات سوچتے سوچتے بھول گئی، اس نے دماغ پر زور ڈالا پر وہ بات یاد نہ آنا تھی نہ آئی۔ "اوں" اس نے اپنے لانبے بالوں کو زور سے جھٹکا دیا، جانے دو جب نہیں یاد آتی، اب کیا کوئی اس کے پیچھے یوں ہی دوڑتا رہے' اس کے جی میں تو آیا کہ وہ لا پرواہی سے کہہ دے: "نہیں یاد آتے تو مت آؤ کر لو میرا کیا کرو گے" اس کو ہنسی آئی گویا وہ کوئی آدمی تھا جس سے وہ باتیں کر رہی تھی۔

ہائے اللہ یہ تم کو کیا ہو گیا ہے اختر نے دوپٹہ کھینچا جو اس کے سینے سے اُتر گیا۔ شاہینہ گھبرا گئی۔ وہ تو خیریت گزری جو وہاں پر کوئی اور نہ تھا ورنہ ان اختر میاں کے تو پھر وہ ایک ہلکا سا تھپڑ ضرور لگاتی اور پھر —— اپنے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن ڈال لیتی" بدتمیز کہیں کا' خبردار جو دوپٹہ چھوا" مگران سب باتوں کا اُسے خیال بھی نہ آیا۔ اور اس کے بجائے اُس نے اختر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چمٹا لیا۔ مگر اختر، وہ شاہینہ کے گھٹنوں تک بھی تو نہ آیا۔

"میرا بھیا بھی، دیکھ کس مزے کی چاندنی ہے بس اب چلتے ہیں۔ اور یہ چندا ماموں"۔

"آپا —— چندا ماموں دور کے ——" اور شاہینہ کا جی الجھنے لگا کہ یہ اختر میری بات تو سنتا نہیں اور اپنی لگائے رہتا ہے۔ شاہینہ نے اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اسے لے کر سامنے کے پتھر پر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ ڈھلکتا ہے تو کیا، یہاں کون بیٹھا ہے اُس نے دوبارا اختر کو زور سے چمٹا لیا۔ مگر وہ گھبرا گیا، آپا کے پیار سے اللہ بچائے" اس بری طرح بھینچتی ہیں کہ ساری ہڈیاں کس جاتی ہیں۔

"دم گھٹتا ہے آپا" مگر شاہینہ کو آج نہ جانے کیوں اپنے بھیا کا دم گھونٹنے میں مزا آرہا تھا۔ ادھر بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے ماحول سے بے خبر ہو گئی تھی —— مگر چاند کی کرنیں اپنی گستاخی سے باز نہ آئیں اور اس کا کشادہ جمپر کھلا ہوا تھا، کتنا خوبصورت گلا تراشا تھا۔ یہ ڈیزائن اس کو کتنی پسند تھی

دھاری دار وائل کا جمپر اس کے جسم پر پھسل رہا تھا۔ سلک ملنی بند ہوگئی ورنہ
سلک کا جمپر ـــــ اس کو اپنے جسم پر سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی اُس نے
آنکھیں جھکا کر اپنے گلے کو دیکھنے کی کوشش کی، گلا کھلا ہوا تھا اور چاند کی
کرنیں گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں، وہ جھینپ گئی اور جھٹ سے دوپٹہ گلے
میں ڈال لیا اور چاند کی طرف دیکھا گویا اس کی نظریں کہہ رہی تھیں "اب
بھی نہیں باز آئے گا، مگر وہ بہت دور والا چاند سچ مچ گھبرا گیا اور جھپاک سے
بادل کے ٹکڑے میں چھپ گیا ـــ اختر اس کی گرفت سے چھوٹ گیا اور وہ
اپنے ہاتوں سے دوپٹہ کا کونا پکڑے ہوئے تھا۔

"کیوں آپا، وہ لڑکے نہیں آئے؟"

"نہیں آئے تو میں کیا کروں جا بُلا لا ــــ"

اور اختر جیسے چپ بھی تو ہوگیا، وہ اپنی ہرنی جیسی آپا سے ڈر رہا تھا۔
جس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی تہوں میں نہ جانے یہ غصہ کیوں گھس گیا تھا۔ اب
اتنی سی بات اگر اس نے پوچھ لی تو اس کا کیا قصور، آخر وہ لڑکے دو دن سے
برابر جو آتے تھے، آندھی پانی بھی آتا تو شاید وہ اپنا آنا بند نہ کرتے نگران کا نہ
آنا تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے، شاہینہ کے ذہن میں پرسوں والا واقعہ
اُبھرنے لگا۔ چاند آہستہ آہستہ بادلوں میں سے سرک رہا تھا ـــ پھر وہ باتیں
دماغ سے ٹکرانے لگیں جو چند اجاتے تھوڑی دیر پہلے دور کہیں دور جا چکی تھیں
ـــ یہ لڑکے کتنے بدتمیز ہوتے ہیں اس کو کیا خبر تھی کہ یہاں پر کوئی اور بھی
ہے۔ پھر تو وہ ہرگز تتلی پکڑنے بھی نہ جاتی جو اسے کہیں بھٹک بھی پڑ جاتی کہ

اللہ مارا کوئی یہاں بھی موجود ہے۔ تتلی پکڑنے کے تصور سے جھینپ سی گئی۔ اس نے بھی تو بے وقوفی کی تھی کہیں تتلیاں بھی کسی کے ہاتھ آتی ہیں۔ وہ تو خود آجاتی ہیں کسی کے پکڑنے سے تو کبھی بھی نہ آئیں گی۔ شاہینہ نے فضا میں اپنا ہاتھ مارا۔ جیسے وہ کوئی کتاب بند کرنا چاہ رہی ہو۔ کتاب تو بند ہوگئی مگر وہ تتلی کے پیچھے برابر دوڑ رہی تھی، اور اچانک جھاڑی میں اس کا دوپٹہ اٹک کر رہ گیا۔ مگر وہ بھاگتی ہی چلی گئی۔ اس تتلی کے پیچھے جو نہ جانے کہاں جھاڑیوں میں غائب ہوگئی۔ اور شاہینہ کھڑی دیکھتی ہی رہ گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مگر دو نوجوان وہاں کھڑے اس کے جسم کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور شاہینہ کے جسم میں ایک بجلی سی کسک پیدا ہوگئی جیسے وہ ننگی ہی تو کھڑی تھی۔ کپڑے سارے کے سارے اس کے بدن سے گر گئے وہ دو اجنبی نظروں سے سمٹ کر رہ گئی۔ اور اس کے پیر گڑ کر رہ گئے۔

"تتلی"۔ ایک نے کہا

دوسرے نے اس کا جواب لذت آمیز مسکراہٹ سے دیا۔ تتلی

شاہینہ نے دل ہی دل میں کہا — بڑا آیا تتلی کہنے والا، اس کے جی میں تو آیا کہ اس کا منہ کچل کر رکھ دے، کوئی کسی کو اس بری طرح دیکھتا ہے شاہینہ کی نظر آپ ہی آپ جمپر پر پڑی۔ کتنا کشادہ گلا تھا اس کا مگر اس کا منہ لال انگارا سا ہوگیا۔ جب اس کی نظر اپنے ہاتھ پر پڑی پاجامے کا ایک پائنچا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کا پیر تو بالکل ننگا تھا — اوئی اللہ اب کیا ہوگا اور تتلی کہنے والا اپنی تیز نظروں سے پڑنے لگا۔

"اب اگر تم نے اپنا پائنچا گرا بھی دیا تو کیا ہم نے دیکھ لیا اور تمھارا اگلا تو ابھی تک کھلا ہوا ہے ۔ اور شاہینہ بھاگتی ہوئی جھاڑی کے پاس گئی، جھپاک سے دوپٹہ کھینچا — چھر سے ایک آواز آئی، اور اس نے مڑ کر دیکھا دوپٹہ پھٹ گیا تھا مگر وہ دونوں نوجوان ہنس رہے تھے، ناحق اس نے اتنی جلدی کی ۔ سیفون کا دوپٹہ تو اب ملتا بھی نہیں ۔

اس نے احتیاط سے اُسے اوڑھ لیا — زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب، وہ دوپٹہ کو اتنے باشعور طریقہ سے اوڑھ رہی تھی ورنہ عام طور سے تو وہ اسے محض اوپر ڈال لیا کرتی تھی، دونوں کاندھوں پر، مگر آج تو ڈھائی گز کا دوپٹہ چھوٹا ہوتے ہوتے اتنا کم ہو گیا تھا کپڑے کا لتا — اور کبھی کبھی تو یہ اتنا لمبا ہو جاتا کہ دادی امّاں کی ڈانٹ سُننا پڑتی

بدنصیب — بے حیا — تیرے نام کی لاج بھی تو نہیں، دوپٹہ تو ٹھیک سے اوڑھ ! یہ کیا لٹکتا پھر رہا ہے جھاڑن کی طرح —" مگر شاہینہ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ چلو اچھا ہوا ۔ جو یہ ڈھائی گز کا ہے، تھوڑی دیر کے لئے تو وہ ملکہ بن جاتی ہے جس کے کپڑے فرش پر لٹکتے رہتے ہیں ۔

"آپا — دیکھو وہ کون آیا" اور وہ تتلی کہنے والا نوجوان آ ہی تو گیا ۔ مگر وہ دوسرا مسکرانے والا — جو اس دن اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، خدا جانے کہاں چھپا ہے ۔ شاہینہ کی نظریں چاند پر پڑیں، نہ جانے اس کے پاس والا تارا کہاں چلا گیا ۔ پاس ہی کہیں ہوگا اور وہ آسمان میں اس کو ڈھونڈنے لگیں مگر اس کا کہیں بھی تو پتہ نہ چلا اس کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے چلند

آج ساری رات اکیلے ہی گزارے گا۔

اختر نے پانی کی سطح پر ایک اور ڈھیلا مارا اور زور سے قہقہہ لگایا۔

"کیوں بے کار کو پانی کو چھیڑتا ہے چل بہت دیر ہو گئی"

اور دونوں کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے نوجوان کی نظریں کبھی پانی کی بے چین لہروں پر پڑتیں اور کبھی ان دونوں راہیوں پر ــــ مگر وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ صبح ہو چکی ہے۔ آسمان سے پہرے اُٹھائے جا رہے ہیں۔ چاند اپنی جگہ پر بھی ہے تو کیا دھندلا تو ہو ہی گیا ہے۔ مگر شعور نے جب اُس کی آنکھ کھولی تو چاند وہاں سے جا بھی چکا تھا۔ اور اس کا لاشعور یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ زمین گھومتی ہے یا چاند، کبھی کبھی تو چاند بادلوں میں سرکتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس نے پانی پر ڈھیلا مارا جو اپنے دیرینہ اصول کے ماتحت پہلے تو تڑپ گیا مگر پھر حلقے بنانے لگا اور اس کو خیال آیا کہ اس نے پہلے اسی طرح ڈھیلا مارا تھا جو سکون میں بھی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ مگر اس کی تو آنکھیں نمناک ہو گئیں جب اس نے دیکھا کہ وہ پانی حسب معمول ساکن ہو گیا۔

اگلے روز جوابی حملے کے طور پر شاہینہ اپنے ساتھ صفیہ کو بھی لیتی آئی صفیہ کی بڑھی ہوئی شوخیاں ہی کبھی کبھی اس کو لڑکیوں کے زمرے سے آگے بڑھانے کے لئے کافی ہوتی تھیں، وہ اُچھلتی بھی تو اس طرح کہ سارے کا سارا جسم چھاچھ کی طرح اچھل جاتا تھا۔ ہنستی بھی تو جیسے آبشار سے پانی گرتا ہو۔ کالج کی سب لڑکیاں اُس کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے

تو چڑھتی نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دن بھر اُچھل کود، مگر شاہینہ ہی ایک ایسی لڑکی تھی جو اس کو "جانِ دوشیزگی" کہہ کر ہنسی مذاق میں ٹال دیا کرتی تھی۔ اور اس طرح پھر وہ ان کے زمرے میں شامل ہو جاتی تھی، اُچھل کود کی عادت تھی تو کسی کا کیا بگاڑتی ہے اسی لئے تو شاہینہ اس کو اپنے ساتھ اور بھی لائی تھی کہ طبیعت اور بہلے گی ورنہ نہر کے کنارے آخر کوئی کہاں تک بیٹھ سکتا ہے اور یہ اختر جس سے بات بھی تو کرنی نہیں آتی ــــــ یا پھر چلو چلو کے نعرے لگاتا ہے، نہیں تو خاموش پانی کو ڈھیلے مار مار کر چھیڑتا جاتا ہے ــــ مگر سفینہ بھی تو اس کے کہنے کی کب تھی، منع کرتے کرتے درخت کو پکڑ کر جھولنے لگی۔

وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ چاند کی کرنوں کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور یہ اندھیرا بھی عجیب ہے جو خود بڑھتا جاتا ہے۔ مگر چاند کے پیالے میں روشنی اور شوخی گھولتا جاتا ہے۔

چاند کی کرنیں، نہر میں ایک اور مہتاب بنا چکی تھیں اور وہ حسبِ معمول چاندنی بکھیر رہا تھا، کوئی اس کو دیکھے یا نہ دیکھے ــــ اور اس کی نظریں شاہینہ کے گلے پر اپنی کمندیں ڈال رہی تھیں، اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر ایک شعوری حرکت سے دوپٹہ کو گرا دیا۔ گویا چاند سے کہہ رہی ہو ــــ

"دیکھ لے میرا کیا لے گا" مگر چاند کو اُس کے اس فعل کا ذرا بھی احساس نہ تھا جیسے اس نے اسے دیکھا ہی نہیں ــــ نوجوان آ چکا تھا مگر شاہینہ کا دوپٹہ ابھی تک سرکا ہوا تھا، وہ چونک پڑی لیکن نوجوان نے بھی چاند

کی طرح اس کے ڈھلکے ہوئے دوپٹہ کا خیال بھی نہ کیا اور جھولتی ہوئی صفیہ پر
اس نے اپنی نظریں گاڑ دیں، مگر صفیہ جھولے جا رہی تھی۔ جیسے آج ہی تو اُسے
کھُل کھیلنے کا موقع ملا ہے۔

"صفیہ! دیکھو وہ آ گیا ـــ اِدھر آ جاؤ" اس نے آہستہ سے کہا

"آنے دو میرا کیا کرے گا۔ تم ہی اپنا دوپٹہ سنبھالو" شاہینہ جھینپ
گئی اور آہستہ سے اس نے سر پر آنچل ڈال لیا سچ کہتی ہیں لڑکیاں ـــ
بھلا یہ بھی کوئی شرارت ہے۔ اجنبیوں کے سامنے ایسی بے باکی سے جھولنا۔
ـــ وہ کیا کہتا ہوگا، اس نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھا مگر اس کی نظروں
کو اپنی طرف نہ موڑ سکی۔ اُس کی نظریں کس بری طرح صفیہ پر پڑ رہی تھیں
اور شاہینہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ننگی ہی تو کھڑی تھی۔ کپڑے سارے
کے سارے اس کے بدن سے گر گئے تھے، مگر صفیہ اور تیزی سے جھول رہی
تھی۔ یہ نظریں بھی تو اس کے جسم کو نہ سمیٹ سکیں۔

"اور یہ لڑکا بھی تو ـــ" وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی، اس کا دوپٹہ بھی تو
اس کے سر سے ڈھلک گیا مگر وہ تو ابھی تک صفیہ ہی کو گھور رہا تھا، شاہینہ
کے سامنے گویا آئینہ رکھا ہوا تھا، چہرے پر جھرّیاں دکھائی دے رہی تھیں
اور بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کا منہ لال انگارا ہو گیا۔ صفیہ تتلی کو دیکھتے ہی
شاخ چھوڑ کر اس کی طرف دوڑی اور بات کی بات میں چوکڑی بھرنے لگی۔
نوجوان کی للچائی ہوئی نظریں شکاری کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھیں ـــ
شاہینہ کا دوپٹہ سرکا ہوا تھا۔ اس کے بال بے ترتیبی سے بکھر رہے تھے۔

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہوگی۔ چاند کی کرنیں اس کے جمپر میں گھسی جا رہی تھیں مگر وہ نوجوان ہر چیز سے بے پروا صفیہ کو دیکھ رہا تھا۔ شاہینہ کا غصّہ بڑھنے لگا۔ اچھی مصیبت لے آئی۔

صفیہ کے کپڑے اس کے جسم سے بغاوت کر رہے تھے مگر جانِ دوشیزگی تتلی پکڑنے میں مشغول تھی۔ بے وقوف لڑکی، کہیں تتلیاں بھی کسی کے ہاتھ آتی ہیں، وہ تو آجاتی ہیں، پکڑنے سے تو کبھی بھی نہیں آئیں گی۔ شاہینہ کو یاد آیا کہ وہ تتلی کہنے والا لڑکا نہیں آیا۔ دو روز سے اس کا کہیں پتہ نہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے، کاش وہ آجاتا، حد ہوگئی بے باکی کی۔ جوان لڑکی کو کوئی اس طرح گھورتا ہے۔ اس نے غلطی کی جو صفیہ کو اپنے ساتھ لائی، اکیلی ہی بھلی تھی ——— یہ سب خیالات اس کے دماغ میں پلٹا کھا رہے تھے۔

"اختر بھیا ——— یہاں تو آنا" اور وہ اختر کا انتظار کئے بغیر ہی اس کے پاس چلی گئی ———

"میرا بھیّا بھی ———" اس نے پھر اختر کو کل کی طرح چمٹا لیا مگر وہ اس کے کولھوں تک بھی تو نہ آیا۔

"دم گھٹتا ہے آپا تم کو کیا ہوگیا ہے"!

"ہٹ پرے کو، بھلا اس میں دم گھٹنے کی کیا بات" اس نے نوجوان کی طرف دیکھا جواب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا اور صفیہ دور سے کھڑی اس کو چڑھا رہی تھی۔

"بے حیا کہیں کی ——— اس کے نام کی شرم بھی تو نہیں، آج لائی تو لائی

اب کبھی جو لاؤں“۔۔۔ ” اس کے قدم تیزی سے صفیہ کی طرف بڑھے۔
چل بھیا چلیں، کتنی دیر ہو گئی“۔ اُس نے جھٹکے سے دوپٹہ اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ اور گھور کر اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی۔

”جاؤ مجھے مت دیکھو! میں بدصورت ہی بھی“ اس نے دوپٹہ اپنے کاندھے پر ڈال تو لیا مگر پھر بھی اس کو تسکین نہیں ہوئی، اس نے پھر سر پر اچھی طرح اوڑھ لیا۔ اور لپٹ پٹا کر صفیہ کی طرف چل دی۔۔۔ اگر آج کہیں دادی اماں دیکھ لیتیں تو خوش ہی ہو جاتیں۔

”بڑی حیادار ہے میری بیٹی۔۔۔ لاکھ میں ایک ہے، دیکھو کیسے سلیقہ سے دوپٹہ اوڑھتی ہے“ شاہینہ کی آنکھوں میں اتنی حیا نہ جانے کہاں سے سمٹ کر آگئی تھیں۔۔۔

”چلو چلیں“ صفیہ نے کہا۔

اور تینوں کے قدم آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ آج اختر نے پانی پر ڈھیلا بھی نہیں مارا، وہ خوشی سے چلا جا رہا تھا۔ راستے پھر اس نے سکوت کو نہ توڑا حالانکہ دونوں کے دلوں میں خیالات کا طوفان امڈ رہا تھا۔

دو دن ختم ہو چکے تھے تیسرا دن تھا۔ شام اپنا ڈیرا لئے چڑھتی چلی جا رہی تھی، آج تارے بھی کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے، مطمئن تھے، اچھا ہے وقت کا بہترین حصہ یہی ہے چلو جتنا بھی وقت مل جائے ورنہ جب چاند نکلے گا تو انھیں پھر اپنے

چراغوں کی لو ہلکی کرنی پڑے گی۔ اب تو موقع غنیمت ہے۔ نہ جانے کب چاند نکل آئے وہ بھی ہلکے ہلکے نہر میں گھومنے لگے جیسے نہر میں آئینہ دیکھ رہے تھے۔ سامنے والا درخت چپ چاپ کھڑا تھا۔ کوئی اس کو پکڑ کر جھولنے والا نہ تھا۔ شاہینہ اور اختر کو دیکھ کر وہ جھولنے لگا۔ مگر شاہینہ نے ایک نظر ڈالنے کے بعد پھر اس پر سے اپنی نظریں ہٹالیں اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ درخت بھی اس سے سوال پوچھ رہا تھا۔

"میری صفیہ کو کہاں چھوڑ آئیں" مگر درخت تو درخت، نہر کا پانی بھی اچھل اچھل کر اس سے یہی سوال پوچھ رہا تھا، سامنے سے اُڑ کر جانے والی تتلی بھی اس سے یہی سوال کر رہی تھی اور وہ پورے ماحول سے اُلجھنے لگی۔

"وہ لڑکا نہیں آیا" اختر سے نہ رہا گیا۔

"نہیں آیا تو میں کیا کروں" اختر خاموش ہوگیا۔ اس کے دماغ میں پہلے دن کا جواب زوروں سے گونجا۔

جا بَلّا لا۔۔۔ جا بَلّا لا" مگر اُس نے فوراً ایک ڈھیلا اٹھایا اور پانی پر پھینک دیا۔ لہریں حلقہ بنانے لگیں اور وہ بھول گیا کہ شاہینہ نے آج کیا جواب دیا۔ اندھیرا ہوتا جارہا تھا کیوں کہ آج چاند نے بھی جیسے [illegible] کرلیا تھا کہ وہ نہ نکلے گا آخر یہ تارے کہاں تک اس اندھیرے کا مقابلہ کریں گے جو بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔۔۔

مگر نوجوان آگیا۔۔۔

چاند بھی گویا زمین سے نکل کر آسمان پر چڑھ رہا تھا۔ شاہینہ نے پہلے چاند کو پھر نوجوان کو دیکھا۔ اور اپنی نظریں ہٹا کر نہر کی ہلکی لہروں پر گاڑ دیں —— نوجوان نے پہلے دزدیدہ نظروں سے شاہینہ کو دیکھا پھر وہ آہستہ آہستہ بے باک ہوتی جا رہی تھیں۔ شاہینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ "صفیہ کو دیکھا کرو —— اب جو کبھی اس کو یہاں لائی، بڑے آئے اس کو دیکھنے والے —— وہ اب ٹہلتے ٹہلتے نہر کے بالکل پاس ہی پہنچ گئی۔ نہر کے پانی سے اس نے چاند کی کرنوں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے ساری کا پلّو اپنے سر پر ڈال لیا۔ آج وہ ساری پہن کر آئی تھی۔ اور ساری کے پلّو سے اس نے اپنا سر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

نوجوان ایک تتلی کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑا —— شاہینہ کا تنفّس تیز ہو گیا۔

"چل بھیّا چلیں —— بہت دیر ہو گئی"

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے۔ اتنی کیا جلدی"

"نہیں —— چلتا ہے یا یہیں رہے گا" اُس کے قدم اُٹھ رہے تھے اور وہ نوجوان تتلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس کو ہنسی آئی، بے وقوف کہیں تتلیاں بھی کسی کے ہات آتی ہیں۔ وہ تو خود آ جاتی ہیں۔ کسی کے پکڑنے سے تو کبھی بھی نہیں آئیں گی۔ اس کا مکان سامنے نظر آ رہا تھا۔ اور وہ لپٹی لپٹائی چلی جا رہی تھی

—— دادی اماں دیکھ کر کتنا خوش ہوں گی مگر شاہینہ کے دل میں یہ خیال بار بار ستا رہا تھا کہ وہ خوش ہو یا آزردہ۔ اختر نے چلتے ہوئے ڈھیلا اٹھا کر پانی پر پھینکا۔ پانی میں تو جیسے ہل چل مچ گئی اور پھر خاموشی —— آہستہ آہستہ حلقے بن بن کر مٹ رہے تھے۔

راکھ اور چنگاری

آج صبح سے بڑھیا کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نظر آ رہے تھے اور یہ کوئی غیر معمولی بات تو نہ تھی کیونکہ پچھلے دنوں کے جھگڑے آج سمٹ کر اکٹھا ہونے والے تھے۔ آج ان کا فیصلہ بھی ہونے والا تھا۔ بس شاہد کے دفتر سے آنے میں کچھ دیر تھی ورنہ ویسے بارود تیار تھی مگر بڑھیا کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور ان چند دنوں کا غصہ اُداسی اور حسرت میں تبدیل ہو گیا تھا مگر غور سے دیکھنے کے بعد نہ تو حسرت دکھائی دیتی تھی اور نہ اُداسی بلکہ اس کے چہرے کی جھریوں میں بھی لمحہ بہ لمحہ کھنچاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ماتھے کی چوڑائی بڑھتی جا رہی تھی اور آنکھوں کے نیچے جو سیاہی سی پڑ گئی تھی وہ بھی معدوم ہوتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ ہلکی سی سُرخی نے لے لی تھی اور اس کے گال جو عموماً ایک طرف لٹکے رہا کرتے تھے ان میں بھی آج تناؤ محسوس ہو رہا تھا

اور بڑھیا اپنے پان دان کے سامنے بیٹھی ہوئی چھالیا کتر رہی تھی اور چھالیوں کا کترنا در اصل ایک جھگڑے کا نشان بن چکا تھا۔ جب بڑھیا اپنے پان دان کے سامنے بیٹھی ہوئی چھالیا کتر رہی ہو بس سمجھو کہ گھر میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہے اور جتنے دن بھی جھگڑا ہوتا وہ پان دان کے سامنے بیٹھی چھالیا کترتی رہتی اور پھر چھالیا ان دنوں میں کام آتیں جب گھر میں مکمل امن و امان ہوتا۔ جب سب خوش ہوتے اور اپنے اپنے کام میں لگے رہتے اور سچ بات ہے کہ کام کے وقت چھالیا کترنا ایک زبردستی کا کام معلوم ہوتا۔ یہ تو بس اسی کے لئے ہے جس کو کوئی اور کام نہ ہو۔ بس بیٹھی چھالیا کترے۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے اور یہی وجہ ہے کہ جب گھر میں جھگڑا نہ ہوتا تو اس وقت بڑھیا کو پان کھانے کی فرصت بھی مشکل سے ملا کرتی۔ اس وقت تو وہ بس جلدی جلدی آئی کھڑے کھڑے پان بنایا، کھایا اور پھر وہی چرخے کی گھوں گھوں۔ کوئی نہ کوئی کام کرنے کو بیٹھ جاتی۔ ویسے گھر میں کام ہو یا نہ ہو مگر بڑھیا کے لئے کام کی کمی نہ تھی اس کو ضرور کوئی نہ کوئی کام مل جاتا۔ اور وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔ یہی تو کام کرنے کی وہ بے پناہ قوت تھی جس سے اس کی بہو عاجز آ چکی تھی۔ اس لئے کہ جہاں اسے بیکار دیکھا لگی صلواتیں سنانے اور یوں تو بیکار بیٹھنے پر اتنی ناراض نہ ہوتی جتنی اس ہری پیلی کتاب سے جو اس کی بہو فرصت کے لمحات میں اکثر پڑھا کرتی۔

”جب سے یہ نگوڑی کتاب اس گھر میں آئی ہے سارے گھر میں نحستی پھیل رہی ہے اور اس عورت کو بھی بال بچوں کی فکر نہیں۔ بس دن بھر

میم صاحب بنی کتاب لئے پڑی رہتی ہیں ۔ ہم نے بھی اپنے زمانے میں کبھی یہ سب کیا تھا ؟ اور اس کا بھی کیا قصور ہے ۔ وہ تو گھر والا ہی ایسا ملا ہے ورنہ کیا مجال تھی جو یہ ہری پیلی کتاب اس گھر میں دکھائی دیتی ــــ" اور وہ دانت چبا کر رہ جاتی ۔ مگر اس ہری پیلی کتاب کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی ۔ یہ نیستی کی نشانی اسی طرح گھر میں رہتی اور تقریباً اسی طرح ہر روز اس کے کچو کے لگاتی اور جب وہ دیکھتی کہ اس ڈانٹ کے باوجود اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی تو وہ اور جل جاتی ــــ اسی جھلاہٹ میں وہ دوڑ کر ننھے کو جھٹک کر اٹھاتی جا ہے ننھا کھلونوں کے ساتھ بیٹھا کھیلا کرتا ۔ مگر اس وقت وہ اسے اٹھا ہی تو لیتی ــــ "بچے تک کی فکر نہیں ۔ میم صاحب کو وہ تو بس جن کر ڈال دیا ہے ۔ ارے بچے تو سورنی بھی جن لیتی ہے ۔ یہ بھی خیال نہیں کہ اس کو نہلا دھلا کر آدمی کا بچہ بنا دے ۔ اور اپنے کام سے لگ جائے ۔ کام ہی ایسا کون سا ہی گھر کا بکھیڑا کیا کم ہے ۔" وہ بچے کو نہلاتی ۔ کپڑے بدلتی اور ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتی بھی جاتی ۔ اور اس غصے میں بچے کو جھٹکتی پٹکتی اور پھر آپ ہی آپ نہ جانے کیا سوچ کر اس کو پیار کرنے لگتی "بیٹے مت رو تیری قسمت ہی ایسی ہے جو یہ ماں ملی ہے ۔ تیری ذرا فکر نہیں ۔ بھلی ہوگئی یہ ہری پیلی کتاب اولاد سے بڑھ کر ہے ۔ بچہ ادھر ہلکان ہو رہا ہے اور ماں کو کتاب سے فرصت نہیں ہے ۔ ہم نے بھی اولاد پالی ہے ۔ اور کون نہیں پالتا ۔ مگر ایسا بھی کہیں دیکھنے میں آیا ہے کہ بچہ روئے اور ماں کے کان پر جوں بھی نہ رینگے" ــــ اور یہ بات بھی سچ ہے کہ اس کی بہو اس کی ذرا بھی

پروا نہ کرتی نہ جانے کیا عادی ہو گئی تھی۔ ورنہ پھر پتھر پر پانی کی ایک بوند ہی ٹپکے
تو گڈھا ہو جاتا ہے اور یہاں روز کی رنگینی مگر اے لو وہ تو برابر اپنی جگہ پر جمی رہتی
مجال ہے جو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے اور کون جانے کنکھیوں سے دیکھتی ہی رہتی
مگر اس کی گردن وہیں جمی رہتی اس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوتی۔ اور بڑھیا بڑبڑا کر
اپنے آپ ہی چپ ہو جاتی جیسے پیتل کے برتن پر کنکر لگ جائے تو وہ دیر تک
جھنجھناتا رہتا ہے مگر کتنی دیر۔ آخر میں نوا سے بھی فضا میں معدوم ہونا پڑتا ہے
اور پھر وہی سناٹا ــــ اور اکیلی بڑھیا بھی کہاں تک اتنے بڑے گھر میں
سناٹے کو گھسنے سے روکتی ــــ اتنے بڑے گھر میں کل چار نو آدمی تھے۔
ــــ آخر بچوں کی کیا گنتی۔ ایک ڈیڑھ برس کی لڑکی اور دوسرا ابھی گودیں میں
لگا تھا ــــ یہ اور بات ہے جب اس کی بہو بھی ان باتوں کو نہ پی سکتی۔
اور اسے غصہ آتا تو بس وہ ابل ہی تو پڑتی اور پھر تو ایسا معلوم ہوتا کہ
جیسے کسی نے طبلے پر تھاپ دی اور ساز بجنے لگے ۔ اس وقت بڑھیا
کے غصے کا بھی کوئی ٹھکانا نہ ہوتا وہ بھی آسمان سر پہ اٹھا لیتی اور ایسا معلوم
ہوتا کہ وہ بس اسی کی منتظر تھی کہ اس کی بہو کچھ بولے اس کے نہ بولنے سے
تو بڑھیا کی طبیعت الجھتی تھی ہاں مگر اس کی بہو جب بولنے پر آتی تو اس
کی زبان ایسی کترنی سی چلتی تھی کہ اس کو کوئی نہ روک سکتا تھا۔ اور اس کے
غصے کا یہ عالم ہوتا کہ اگر بچی کو گود میں لیے دودھ پلاتی ہوتی تو اس کو اس
زور سے جھٹکتی کہ چھاتی میں ایک عجیب سی آواز آتی اور ایسا معلوم ہوتا
کہ وہ بچی کے منہ سے چھوٹ کر الگ جا پڑی۔ اور وہ تیزی سے جمپر سرکاتی

اس وقت وہ اس قدر عجلت میں ہوتی کہ اگر بچی اپنے مسوڑوں سے بھینچے ہوئے
ہوتی اور دیر میں چھوڑتی تو وہ جلدی میں جمپر بھی نہ سرکا سکتی بس دوپٹہ
پر ہی اکتفا کرتی۔ اپنی چھاتی پر صرف دوپٹہ ہی ڈال لیتی پھر دیر تک اسی
جھگڑے میں ایسے ہوش بھی نہ رہتا چاہے دودھ بہہ بہہ کر دوپٹہ کو تر
کر دیتا۔ اور ایسے موقع پر بچہ ایک طرف گدے پر پڑا ہوا بلبلایا کرتا اور
دودھ بہہ بہہ کر اس کے دوپٹہ کو تر کرتا اور بھیگا ہوا دوپٹہ اس کی بھاری
بھرکم چھاتی پر چپک جاتا۔ مگر وہ تو ان سب سے بے پروا اپنے ہی کام میں
مشغول رہتی وہ تو اس وقت ایک بپھری ہوئی ناگن ہوتی۔ اور کبھی کبھی تو
اس غصے میں اس کی چوڑیاں بھی ٹوٹ جاتیں۔ مگر جب چوڑیوں کے
ٹوٹنے کی آواز ہوتی تو بڑھیا کے غصے کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔ وہ اور زیادہ
چیخ کر کہتی "لونڈیا ہوش کی دوا کر ــــ سب چوڑیاں توڑ ڈالے گی۔
ننگے ہاتھ کرنے کی فکر ہے کیا۔" اور اس کی بہو اس کا مطلب سمجھ جاتی اور
جہاں وہ ترکی بہ ترکی ہر بات کا جواب دیتی وہاں اس کو اپنی اس غلطی
کا احساس ہوتا اور وہ اس کو کچھ نہ کہتے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔ اور یہ
دراصل تھا اس گھر کا معمول ــــ مگر اس بار تو جھگڑے نے اتنا
طول پکڑا کہ ایک ہفتہ ہو گیا اور ساس بہو میں کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ
ادھر منہ پھلائے پڑی ہے اور یہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہیں یا پھر اس سے
تھک گئی تو منہ پر چادر ڈال لی اور پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر میں
کوئی ہے ہی نہیں ــ اس وقت بچاری عذرا کا اور برا حال ہوتا اس

کے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ ہمدردی کرے۔ شروع میں تو وہ ماں اور بھاوج کے درمیان مقابلہ بھی کرتی۔ اُن کی غلطیوں کا دل ہی دل میں احتساب بھی کرتی۔ کبھی سوچتی یہ اماں بھی عجیب آدمی ہیں دن بھر کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا رکھتی ہیں۔ اگر وہ کوئی کتاب پڑھ رہی ہیں تو پڑھنے دو تم سے کیا مطلب اور پھر تمھارا ابگاڑتی بھی کیا ہیں۔ جو تم اس کتب کے پیچھے پڑی رہتی ہو" اور وہ سوچتی کہ تمام ساسیں ایسی ہی ہوتی ہیں مگر دوسرے لمحہ جب بھابی کی حرکتوں پر اس کی نظر پڑتی تو وہ اور اُلجھ جاتی اُن بھابی کو تو بس جھگڑے میں مزا آتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ بڑھیا کو اس ہری پیلی کتاب سے چڑھ ہے۔ وہ اور اُسے اماں کے سامنے ہی لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ لو کر لو کیا کرتی ہو ـــــ یہ نہیں کہ تم کو پڑھنا ہے تو ایک کونے میں ہو کر پڑھو۔ پھر یہ کہ اپنے بچوں کی ذرا فکر نہیں۔ مصالحہ پیسنا ہے تو پیس لے گی عذرا۔ برتن ما نجھنے ہیں تو مانجھ لے گی عذرا۔ اس کے کون سے بال بچے ہیں اور وہ جھنجھلا جاتی۔ بڑی آئیں بال بچوں والی اگر بال بچوں کی وہ دیکھ بھال نہ کرے تو معلوم ہو جائے بیگم کو کہ کیسے ہوتے ہیں بال بچے۔ بس وہ تو منہ میں چھالیاں دیئے پڑی ہیں کچھ فکر نہیں کہ کون آ رہا ہے۔ کون جا رہا ہے اور پھر جھانکتی کیسی وہ جھینپ سی جاتی جیسے سچ مچ اس کی زبان سے ایسی ویسی بات نکل ہی تو گئی اور وہ اپنے آپ ہی سے شرمانے لگتی۔ اور بھابی کا خیال آکر تو اس کا غصہ اور بھی پلٹ پڑتا ـــــ انتقام تھا۔ بڑائی ہوا اور اس پہ یہ حال ـــــ یہ کہو عذرا سارا کام

کر دیتی ہے۔ اور زبان سے ایک حرف نہیں نکالتی۔ دو ہونٹ چپ"۔ اور سچ بات ہے وہ دل میں تو بہت پیچ و تاب کھاتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی۔ دونوں ہونٹ سیئے رہتی۔ حالانکہ اس طرح اس کو غصہ دونوں پر آتا اسی لئے کہ باوجود کوشش کے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ پاتی کہ قصور کس کا ہے۔ بس وہ تو سوچتی دل ہی دل میں دونوں کی غلطیاں نکالتی اور چپ رہتی۔ اور جب کچھ کہتی کبھی تو اس طرح۔ "اماں یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔ چپ بیٹھو۔" اور اس کے اتنا ہی کہہ دینے پر اس کی بھاوج کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔

"عذرا تو بھی ماں کی طرف جھکے گی ——— آخر کو میرا رشتہ ہی ایسا ہے ——— نند ہے نا!"

اور پھر نند کا طعنہ تو عذرا کے جسم میں اور سوئیاں چبھوتا وہ بلک کر رہ جاتی۔ اس لئے کہ در اصل اس کی یہ نیت نہ ہوتی کہ وہ بھاوج کو قصوروار ٹھہرائے وہ تو بس ماں کو کسی نہ کسی طرح چپ کرانا چاہتی۔ مگر وقت کی بات ہے کہ سیدھی بات بھی الٹی ہی پڑتی اور خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی بھابی کا کتنا خیال کروہ وہ تو ہر وقت آپے سے باہر رہتی اب اتنی سی بات کہہ دینے میں کونسی ماں کی طرف جھکنے کی بات تھی اور پھر تو وہ جھنجھلا کر کہتی ——— "اچھا بھائی لڑو میں کچھ نہیں کہتی ——— اور اس وقت بڑھیا موقع کو غنیمت سمجھ کر کہ لڑائی کا رخ پلٹ رہا ہے اور زبردستی عذرا کے ساتھ ہمدردی جتاتی۔

بُس مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔ اس کے کہنے کا تجھے کیا حق ہے۔ یہ کون سا تیرا اکھاڑہ ہے۔ جانے میرے مرنے کے بعد اس گھر میں اس کا کیا حشر ہوگا۔ ابھی میرے ہوتے ہوئے تو یہ حال ہے میرے مرنے کے بعد تو اسے ایک لقمہ بھی ملنا مشکل ہوگا ـــــ اگر آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو مجال ہے جو کوئی ایک حرف بھی کہہ کر نکل جاتا۔ زبان کھینچ لیتے گدی سے ـــ اور پھر اس طرح بڑھیا کے بڑبڑانے کے لئے کوئی نئی بات ہو جاتی ـــ اور عذرا بجائے اس کے کہ اپنی ماں کی ہمدردی سے خوش ہو اور جھنجھلا جاتی تھی کہ چلو لڑنے کے لئے ایک بات اور نکل آئی۔ ویسے ہی جھگڑا کرنے کے لئے اس گھر میں کون سی کمی ہے جو اب میرے ہی اوپر شروع ہو گیا۔ اور یہ سب تو اس وقت کی بات ہے جب شاہد میاں اپنے کام پر نکل گئے ہوتے۔ لیکن یہ جھگڑے ان کی عدم موجودگی ہی پر موقوف نہ تھے۔ بلکہ ان کے سامنے بھی ہوتے تھے۔ یوں بھی شاہد میاں طبعاً خاموش پسند قسم کے آدمی واقع ہوئے تھے۔ اور کبھی کبھار ہی بولتے اور شاید اگر جھگڑے نہ ہوا کرتے تو وہ ہفتوں کیا، مہینوں سکوت نہ توڑتے۔ بس ان کا تو معمول تھا۔ صبح سویرے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ اور پھر گھر میں اس وقت داخل ہوتے جب دفتر کا وقت قریب ہوتا۔ اور پھر نہا دھو، کھانا کھا کر دفتر چل دیتے۔ اور دفتر جانے کے بعد چھ بجے کہیں ان کی شکل نظر آتی۔ اور وجہ بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ پیدل آنا جانا پڑتا تھا۔ سائیکل کا ارادہ برسوں سے کر رہے تھے۔ مگر یہ آرزو تھی اور آرزو کا پورا ہونا آسان نہیں ہوتا ـــــ دو سو روپیہ پاس ہوں تو

سائیکل آئے اور یہاں گھر میں دو سو روپے چھوڑ دو سو پیسے بھی نکلنے مشکل تھے۔ مگر برسوں سے یہ آرزو ان کے دل میں جنے ہی جا رہی تھی کہ شاید دو سو روپے ملنے کی کوئی سبیل اللہ نکال دے ــــ ایک بار دفتر سے پچاس روپے نہ جانے کس حساب میں زیادہ مل گئے تھے سو وہ رکھے ہوئے تھے کہ منی بیدا ہو گئی اور ہوئی بھی تو ایسی کہ بیگم کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بس وہ پچاس روپے آنکھوں دیکھتے پھر سے اُڑ گئے ــــ اور سائیکل کا خواب خواب پریشاں ہو کر رہ گیا ــــ مگر آرزو تھی کہ جنے جاتی تھی ــــ چنانچہ اسی پیدل چلنے کی وجہ سے چھ بجے گھر میں ان کی شکل دکھائی دیتی۔ سر جھکائے نڈھال ـ جیسے کمر پر منوں بوجھ ڈالے ہوئے آ رہے ہوں ۔ اور اس وقت ان سے چلا بھی تو نہ جاتا تھا۔ بس آئے اور چپ چاپ پڑ گئے۔ اور دیر تک ایسے ہی پڑے رہتے۔ البتہ جب پہلے شام کو چائے بنتی تھی تو شاہد میاں سیدھے غسلخانے پہنچتے اور منہ ہاتھ دھو کر چائے کا انتظار کرتے اور جب چائے آجاتی تو میاں بیوی بیٹھ کر پیتے اور عذرا کو بھی ایک پیالی مل جاتی ! ـ تھوڑی دیر کے لئے ایسا معلوم ہوتا کہ اس چھوٹے سے گھرانے میں ہزاروں مسرتیں سمٹ کر آگئی ہیں اور شاہد میاں کا چہرہ چمکنے لگتا ـ اگر اس وقت کہیں دو گنی تھکن بھی ہوتی تو بھی اتر جاتی۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے شام کی چائے بھی بند ہو گئی تھی اور جب صبح کی چائے کے لالے پڑے ہوں دو وقت کی روٹی مل جائے یہی بہت ہے ۔ ایسے وقت میں چلئے کی کس کو سوجھتی ہے اور شام کی وہ عیاشی اس طرح ختم ہو گئی ـ وہ مسرتیں بکھر گئیں جو شام

کی ایک پیالی کے گرد منڈلانے لگی تھیں ـــــ اور جب پچھلے دنوں شاہد میاں کو معلوم ہوا کہ بہتر روپے میں ایک پیسہ بھی تنخواہ میں بڑھنے والا نہیں ہے تو پھر ان کو خرچ کم کرنے کی سبیل سوچنی پڑی اور سوچا بھی گیا تھا۔ کھانے میں کمی کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دھوبی کا خرچ کم کیا جاسکتا تھا سو وہ پہلے ہی کم ہو گیا تھا۔ اب تو کپڑے بھی گھر میں دھلنے لگے تھے۔ لے دے کر شام کی چائے ہی رہ گئی تھی۔ جس پر اماں کا غصہ نازل ہوا کرتا تھا، وہ بھی لب سامنے آگئی تھی۔ اس کے لئے دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ اس کو پہلے ہی سے عیاشی سمجھا جا رہا تھا۔ بالآخر ایک دن وہ بھی بند ہو گئی۔ اور پھر شاہد میاں دفتر سے آکر دھڑام سے گر پڑتے۔ وہ چار روز تو ضرور تکلیف ہوئی مگر پھر تو آپ ہی آپ لیٹے لیٹے تھکن نکلنے لگی اور شام کی چائے اس طرح آئی گئی ہو گئی ـــــ ہاں تو یہ تھا شاہد میاں کا روزمرہ۔ اور جس روز اماں کا غصہ تیز ہوتا اس روز نہ پوچھو کیا حال ہوتا۔ وہ شاہد میاں کو اور سُنا سُنا کر بگڑا کرتیں اور عذرا کی طرح شاہد میاں کو بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس میں زیادتی کس کی ہے۔ شروع شروع میں تو انھوں نے خود بھی مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ـــ مگر اس کے بولنے سے ـــ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ـــــ پھر یہ سوچ کر کہ کتے کی دُم سیدھی کرنی ممکن نہیں اس نے جھگڑے کی جانب اسی طور سے دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی کتے کی ٹیڑھی دم کی جانب کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے ـــ اور اس بار تو جھگڑے کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔ یہ جھگڑا کسی طرح کم ہونے کا

نام نہ لیتا تھا اور شاہد نے دخل نہ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ مگر گھر کی افراتفری دیکھ کر جب بھی کہاں تک رہتا۔ اس لئے کہ بیگم ادھر منہ دیئے پڑی ہیں اور اماں ایک طرف میٹھی چھالیا کتر رہی ہیں یا دوپٹہ تانے چارپائی پر دراز ہیں۔ اور سرِ شام ہی سارا گھر قبرستان ہو جاتا۔ جہاں لیا معلوم ہوتا کہ مُردوں سے کوئی شرط بدی ہے۔ عذرا بیچاری کے سر سارے گھر کا کام کاج پڑ جاتا۔ وہ مرتی نہ تو کیا کرتی۔ مجبوراً اسے ننھے کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی اور گھر کا کام کاج بھی ——— پھر ایک بڑی فکر جو تھی وہ چھوٹی بچی کی طرف سے تھی ——— جو دودھ کے بنا بلکتی رہتی تھی اس لئے کہ بیگم کا غصہ بھی غضب کا تھا۔ وہ تو اسے بس واجبی ہی واجبی دودھ پلاتی۔ دوسرے دودھ بھی کیا زور کرے گا۔ کئی روز سے منہ میں ایک دانہ تو اڑ کر گیا نہیں تھا۔ جب کھائے گی ہی نہیں تو کیا دودھ ہوگا بچی بھی بس زبردستی ہی چھاتی چوستی تھی ——— اور یوں تو پہلے بھی دودھ کم ہی تھا۔ بازار سے آسٹر ملک کا ڈبہ آتا تھا اور مہینے بھر کیلئے کافی ہوتا تھا۔ مگر کچھ دنوں سے وہ بھی بلیک مارکیٹ میں ساڑھے چار کے بجائے آٹھ روپے کو آ رہا تھا۔ اور شاہد میاں کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اب اسے خرید کر لائیں کیوں کہ یہ ساڑھے چار ہی خرچ کرتے وقت دانتوں پسینہ آ جاتا تھا اور اب بھلے سے اس کا دام آٹھ روپیہ ہو گیا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ خوش ہوئے کہ چلو ہر مہینے کا ساڑھے چار کا یہ خرچ بھی کم ہوا اور بچی بھی اب سوا برس کے اوپر ہو گئی ہے۔ کیوں نہ اسے خوراک پر ڈالا جائے۔

اور اس طرح یہ اوپر کا دودھ کچھ دن پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ بچّی کو صرف ماں کے دودھ پر رہنا پڑتا تھا۔ وہ بڑی چلاّتی رہتی اور کچھ نہ کہتی —— آخر شاہد میاں کو ایک صورت سمجھ میں آگئی تھی اور وہ بازار سے اس کے لیے پانچ آنے کی ایک چُسنی لے آئے تھے۔ اور اب جب اس نے دودھ کے لیے رونا شروع کیا۔ بس اس کے منہ میں چُسنی لگادی اور وہ بڑی چوستی رہتی۔ آخر تو سوا برس کی جان تھی۔ اس کا بہلانا کیا مشکل تھا۔ یہاں تو لوگ بڑے بڑوں کو بہلا کر سُلا دیتے ہیں —— وہ سوا برس کی بچّی بس آگئی چسنی کے دھوکے میں۔

چنانچہ دن کا بیشتر حصہ اس طرح گزر جاتا اور بیگم کو بھی آرام ملا۔ کہ چلو اس بہانے سے اس کا رونا بھی کم ہوا —— لیکن اب جو گھر میں تنازعہ اُٹھا تو بیگم صاحبہ نے دودھ کی الگ کھینچ کر دی —— بس وہ تو یوں ہی پڑی رہتی گم سُم منہ ڈھلکے —۔ بچّی بھی چُسنی ایک طرف اُگل دیتی آخر اس میں سے کچھ نکلتا تو تھا ہی نہیں —— اس تین چار دن میں وہ اور بھی نڈھال ہوگئی تھی۔ ننھے کی تو پھر بھی عذرا دیکھ بھال کرلیتی اور اپنے امکان تک تو وہ کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتی مگر بچّی کے معاملے میں لاچار تھی۔ زیادہ سے زیادہ دن میں آٹھ دس مرتبہ بھاوج کی خوشامد کرلیتی۔ اور اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ مگر ان کے غصّے کے آگے اس کی کیا چلتی۔ جب شاہد میاں کی بات کا اثر نہیں تو پھر اس کا کیا ہوتا وہ تین میں نہ تیرہ میں۔ منّی کو گود میں لے کر تھوڑی دیر بہلانے کی کوشش

بھی کرلی ۔۔۔ جسے منی منہ میں دیتی مگر جیسے کا راز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منی بھی سمجھ گئی تھی ۔ وہ بھی اُسے نہ لیتی اور اس طرح اماں کے تیور بھی بدلنے لگے ۔ اور انھوں نے دھیرے دھیرے بڑبڑانا شروع کر دیا اور پچھلے کئی دنوں سے انھوں نے ننھے کو بھی نہ چھوا تھا ۔ اور نہ ہی منی کو ہاتھ لگایا تھا ۔ اور وہ بھی موقع ڈھونڈھ رہی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح پوتی کو گود میں لے لیں اور پھر منی کا بلکنا ان سے بھی نہ دیکھا جاتا تھا اور بار بار ان کا جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر پوتی کو گود میں اٹھا لیں اور اس کو گود میں اٹھا کر پیار کر لیں ۔۔۔ ادھر منی کی روز بروز کی لاغری سے وہ اور پریشان ہو رہی تھیں ۔۔۔ آخر ان سے بھی نہ رہا گیا ۔ اور جب شاہد میاں دفتر سے آئے تو پھر ایک دم ان پر برس ہی تو پڑیں ۔۔۔ میں کہتی ہوں سمجھا لو اپنی لاڈلی کو ۔۔۔ یہ چہیتی جو اس طرح ڈیڑھ بالشت کی بچی کی جان سے کھیل رہی ہے اس کا ذمہ دار کون ہوگا ۔۔۔ اٹھا کر دیکھو لڑکی کا کیا حال ہو گیا ہے چار روز میں سینک سلائی ہو گئی ہے ۔ ان کا کیا ہے : یہ بیگم صاحبہ تو پہنے ہیں پھر ایک اور جن کو کنٹری ہو جائیں گی لونڈیا اپنی جان سے جائے گی ۔ اور ان کا کلیجہ نہ جانے کتنی دیر تک چلتا رہتا جو شاہد میاں نے بیچ میں قطع کلام نہ کیا ہوتا ۔۔۔ میں کیا کروں کون سا تم کو سمجھا سکتا ہوں جو اس کو سمجھا لوں گا جس کا جو کچھ جی میں آئے کرے میں کچھ نہیں کہتا ۔ مرنے دو بچی کو مجھے فکر نہیں ۔۔۔“ اور شاہد میاں نے اپنا کوٹ ایک طرف پھینک دیا ۔ اور پھر قمیص سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر جو رومال میں بندھا ہوا تھا ، ایک طرف کو

رکھ دیا ــــ "یہاں دفتر سے مر کر آؤ اور گھر میں قدم رکھو تو پھر وہی واتا
کلکل ـــ نہ جانے یہ جھگڑے کب ختم ہوں گے۔ صبح شام وہی جھگڑے۔
نہ ہی بے بات کی بات" شاہد میاں بڑبڑا رہے تھے۔ اور بیگم صاحبہ ایک
طرف پڑی سسک رہی تھیں اور اماں کا یہ حال تھا کہ جیسے کسی نے دریا
کا بند کھول دیا ہو، آنکھوں سے پانی جاری تھا ــــ اور عذرا ایک طرف
کھڑی تھی۔ اس کے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ کس کو چپ کرے اور
کرے تو کیسے؟ پھر جب وہ ہر ایک کی عادت سے واقف تھی کہ دونوں
اپنی ضد کی پکی تھیں اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر دم تیار رہتی
تھیں۔ آخر ایسی صورت میں وہ بھی کیا کرتی چپ ٹکر ٹکر دیکھتی رہی اور بھیا
کی طرف سے بھی سوچ میں پڑ گئی جو ابھی دفتر سے آئے تھے۔ اور آتے ہی
گھر میں ایک دم سے یہ کھیل تماشے شروع ہو گئے۔ ایک بار تو اس کے جی میں
آیا کہ بھیا سے کہہ دے کہ "ہونے بھی دیجئے جھگڑے۔ آپ کو کیا پڑی ہے
جو اس میں پڑ رہے ہیں ــــ مگر بھیا کے غصہ کو دیکھ کر وہ چپ ہو
رہی۔ اس کی بھی ہمت نہ پڑی کہ کچھ بولے۔ وہ یہ بات سوچ کر ہی رہ گئی
زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا ــــ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے
اپنا جی کڑا کر لیا اور ایک مرتبہ ہمت کر کے بول ہی تو پڑی۔ "چھوڑیئے
اس جھگڑے کو بھیا، آپ منی کے لئے کہیں سے دودھ کا بندوبست کر دیجئے
صبح سے بے دم ہو رہی ہے" اس وقت بھیا کی تیوری پر نہ جانے کتنے
بل آئے اور گئے مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر پیالی اٹھائی اور باہر چل دیئے۔

اور اماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بڑا پہاڑ سر پہ سے اُتر گیا ہو اور وہ دوڑتی ہوئی گئیں اور عذرا کی گود سے منّی کو اٹھا کر لے آئیں اور منّی نہ جانے کتنی دیر سے بلک رہی تھی ان کی گود میں آتے ہی چپ ہو گئی اور پھر اس نے ایک بھی ہچکی نہ لی اور مزے میں ان کی گود میں جا پڑی۔

عذرا نے جو مڑ کر دیکھا تو باورچی خانہ سے آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ عذرا دیکھتے ہی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی جو باورچی خانے میں پہنچی تو گرتے گرتے بچی اور اتنی تیزی سے سانس پھول گیا کہ پورا جسم چھاج کی طرح اُچھلنے لگا۔ اور اماں کی نظر اگر آگ کی لپٹوں پر نہ پڑتی تو شاید اس کے اس طرح دوپٹہ گلے میں ڈال کر دوڑ پڑنے پر وہ خوب ہی خبر لیتیں اس لئے کہ وہ جب دوڑتی تو پھر اس کو اپنے سیانے پن کا بھی احساس نہ رہتا جس کے کچوکے اماں دن رات لگاتی رہتیں مگر اس وقت تو بات ہی دوسری تھی، وہ بھونچکا سی رہ گئیں۔ عذرا باورچی خانے میں جا کر دیکھتی ہے تو بھابی بڑے زوروں میں کسی کتاب کو پھاڑ کر جلا رہی ہیں ـــــ اور ایک مرتبہ اس نے جوان کا دوڑ کر ہاتھ پکڑا تو اس کی نظر اس روشن لپک پر پڑی کیا دیکھتی ہے کہ کوئی لال پیلا کاغذ جل رہا ہے اور وہ کپکپا گئی کہ ضرور آج "اماں کی" لال پیلی کتاب نذر آتش ہو گئی ـــــ اور وہ کانپ اُٹھی "ارے بھابی یہ کیا کیا ـــــ تم نے لال پیلی کتاب جلا ڈالی" اس نے کہنے کو تو زور سے کہہ دیا مگر اسے شک تھا کہ یہ وہی کتاب تھی یا کوئی ردّی کا غذ ـــــ مگر کہتے وقت اس نے اپنے شک کی بھی پرواہ

نہ کی اور یوں سمجھو کہ بس وہ لال پیلی کتاب جل گئی جس نے اماں کو مہینوں سے لال پیلا کر رکھا تھا۔

ذرا سی دیر میں شاہد میاں آ گئے۔ عذرا نے ان سے دودھ لے کر گرم کرنے کو رکھ دیا اور پھر ذرا سی دیر میں جو شاہد کی نظر پڑی تو اماں منّی کو دودھ پلا رہی تھیں۔ شاہد کے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر اماں کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر ان کی کچھ ہمت بندھی اور انھوں نے نوٹوں کا رومال اٹھایا جس میں تنخواہ کے روپے بندھے ہوئے تھے اور انھوں نے لے کر اماں کے آگے رکھ دیا۔ اُن روپوؤں کو دیکھنا تھا کہ اماں کا پارا اور چڑھ گیا ــــ "میں کہتی ہوں دے دو اپنی چہیتی کو ــــ چلا میں ستر روپلی میں گھر کا خرچ ــــ اسی کے مارے تو روز طعنے دیتی تھی ــــ مجھے ضرورت نہیں۔ جب میرا گھر والا تھا تو میں نے بھی عیش کر لئے۔ ساری تنخواہ میرے ہاتھ میں رہتی تھی اور اسی میں میں نے سب کو عیش کرائے ــــ اب میرے پاس کیا رکھا ہے ــــ یہ سفید چونڈا ہے ــــ اور اماں نے روپیوں کا بنڈل ایک طرف کو پھینک دیا اور شاہد کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے سوائے اس کے کہ وہ جا کر ایک مرتبہ بیوی پر بگڑا" کیا خواہ مخواہ کے جھگڑے کر دیتی ہو، کون سے ایسے بہت روپے ہیں جو بات بڑھاتی ہو اگر کہیں روپے زیادہ ہوتے تو نہ جانے کیا حال ہوتا اور پھر وہ بھی کتنے دن ہاتھ میں رہتے ہیں۔ دور دن میں سب برابر ہاتھ خالی ــــ اور اس کے جواب میں ان کے آنسوؤں اور سسکیوں میں اور اضافہ ہو گیا اور

وہ بھی اس سے زیادہ کیا کرتا۔ اس لئے کہ بیگم کی عادت سے خوب واقف تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک تو اُسے غصہ دیر میں آتا ہے اور پھر جب آتا ہے تو کسی کے روکے نہیں رک سکتا اور آج ہی نہیں بلکہ بارہا اس نے دیکھا ہے کہ اس غصہ کا عروج ہی یہ ہے کہ جی بھر کر رو لیتی ہے اور خوب آنسو بہا لیتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ پھر وہ چپ ہو گیا اور اس نے بہتری اسی میں دیکھی کہ کسی طرح بات آئی گئی ہو جائے۔ اور اماں بھر اس روپے کو رکھ لیں ——— حالانکہ دوروز سے زیادہ چلنے والا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ تنخواہ ملنے پر اُسے کبھی خوشی نہیں ہوئی اگر خوشی ہوتی تھی تو بس اتنی سی بات کی کہ سامنے والے بنیئے کا سلام ختم ہو جلئے گا جو پہلی تاریخ کے آتے ہی سڑک پر چلنا مشکل کر دیتا تھا۔ آتے جاتے صبح شام "بابو صاحب سلام" کی رٹ لگا تا رہتا اور کئی بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اس بنئے سے کہہ دے کہ " کبھی مت پریشان ہو تنخواہ ملتے ہی تمہارے پیسے پہلے بھجوا دوں گا۔ بعد میں دوسرا خرچ دیکھا جلئے گا۔" مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی وہ سوچے گا کہ "میاں کو سلام بھی ناگوار گذرتا ہے" اور یہ سوچ کر وہ چپ رہا ——— بارہا یہ خیال بھی اس کے دل میں آیا کہ کسی دوسرے کے یہاں سے حساب شروع کر دے مگر پھر اس خیال کو بھی درگذر کرنا پڑا اس لئے کہ اس کی دکان پھر بھی گھر کے سامنے ہے، بہت کچھ آرام ہے ———

ہاں تو یہی سب باتیں اس کے دماغ میں آکر گڈمڈ ہونے لگیں اور یہ حقیری تنخواہ ۰۱ اس کے سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس میں بھی کچھ جھگڑے کی گنجائش تھی اور پھر جب اس کو معلوم ہوا کہ اس میں پانچ روپے کم ہو گئے ہیں تو اس کے جسم میں اور خون خشک ہونے لگا۔ اور اس نے صحن میں نوٹوں کا بنڈل اماں کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا۔ "اماں اس میں کل سرسٹھ روپے ہیں"

"سرسٹھ" ـــــ اماں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "باقی پانچ کیا ہوئے" اور اس گھبراہٹ میں وہ اپنا غصہ بھی بھول گئیں اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا انہوں نے رومال کھول کر انھیں گننا شروع کر دیا۔ سرسٹھ روپے نہ کم نہ زیادہ ـــــ اور ان کے غصہ کا پارا پھر چڑھا ـــــ "یہ پانچ روپے کس جورو کو دے آئے۔ تمھاری عقل ماری گئی تھی کہ گھر کا خرچ ویسے ہی ٹھیک سے نہیں چلتا تھا اور آپ دے آئے اپنی لگتی کو ـــــ یہ نہ سوچا کہ لونڈیا کے گدا ہے نہ لحاف ـــــ اور جاڑا ہے کہ چڑھا چلا آرہا ہے ـــــ پھر بچے والی اور کسی کو ہو نہ ہو اس کو تو ضروری ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ دس روپے اب کے گتے کے لئے نکال لوں گی اور میاں چھیلا نہ جانے کہاں رکھ آئے" اور شاہد کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔

"اماں میں کیا کروں کوئی خوشی سے تھوڑا ہی دے آیا۔ دفتر میں مہاتما گاندھی کے نام کا چندہ ہو رہا تھا۔ سرکاری حکم تھا۔ دینا نہ تو کرتا کیا

پھر آج کل نوکری کہیں آسانی سے ملتی ہے۔ تم کو کیسے سمجھاؤں اماں ـــ"

لیکن اماں کا غصہ مدھم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا ـــ "چلو یہ چندہ اور مصیبت ہو گیا ـــ ایک تو بہتّر روپلّی میں گذر ہونی مشکل ہے اور پھر یہ مصیبت الگ آن پڑی ـــ خراب چاہے کچھ ہو، سارا گھر بھوکا مرے مگر لونڈیا کے لئے گدّا ضرور آئے گا" اور یہ کہہ کر اماں نے سرسٹھ روپئے میں سے دس روپئے نکال کر الگ رکھ دیئے ـــ اگر دفتر میں چندہ دیا جائے گا تو زندہ رہنے کے لئے گدّا بھی ضروری ہے۔ ادھر غلّہ مہنگا ہو رہا ہے ادھر چندہ ہو رہا ہے اور اماں نے دس کا نوٹ اٹھاتے ہوئے عذرا کو آواز دی۔

"لے عذرا اپنی بھابی کو دے دے۔ اتوار کے دن اپنے گدّے کے لئے کپڑا منگا لے گی۔ جاڑا سر پر آگیا۔ کھانے کو دیکھا جائے گا۔ بھلے سے سوکھی روٹی کھائیں گے مگر جاڑے میں تو بچّی نہیں مرے گی"۔

اور عذرا کے خاک سمجھ میں نہ آیا کہ جھگڑا ختم ہو گیا یا ابھی باقی ہے۔ اس نے تو بس وہ دس روپے کا نوٹ بھابی کی چارپائی پر ڈال دیا اور بھابی دوپٹّے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی اور پھر اس نے منّی کو بھابی کی گود میں ڈال دیا اور منّی بھی اس کی گود میں جا کر نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگی۔

اس وقت عذرا کا دماغ بھی ماؤف تھا۔ اس کے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا اور شاہد اپنی چارپائی پر بے دم پڑے تھے جیسے ابھی دفتر

سے آرہے ہوں ۔ اور گھر میں ایک بار پھر سناٹا ہو گیا۔ جیسے آگ لگنے کے بعد بجھنے پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے ۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ستاون روپے میں کس طرح گذارا ہو گا اور یہ ۶ نفر ــــ اس کی خاک سمجھ میں نہ آیا ــــ اس نے دیکھا کہ زندگی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ افتاں وخیزاں ــــ مگر کوئی نہ کوئی خرچ تو کم کرنا ہی ہے ۔ اور اس کو خیال آیا کہ کپڑے تو گھر میں دھلنے ہی لگے ، چائے بند ہو گئی۔ بس دو وقت روٹی ملتی ہے۔ اس میں کیسے کمی کرے ، وہ دیر تک سوچتا رہا۔ مگر جب اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے دماغ کی کھڑکی بند کر دی ۔ اماں جانماز پر کھڑی نماز پڑھ رہی تھیں اور بیگم صاحبہ چولھا پھونک رہی تھیں ــــ ادھر عذرا زبردستی منّی کے منہ میں حسنی ٹھونس رہی تھی ۔ گھر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ خوفناک سناٹا ــــ جیسے آگ بجھ گئی تھی ۔ راکھ کا ڈھیر پڑا تھا ۔ مگر باورچی خانے سے پھکنی کی پھوں پھوں کی آواز آرہی تھی ــــ پھر اُسے تکیے کے اندر نہ جانے کیا شے معلوم ہوئی۔ اس نے تکیہ اٹھا کر جو نکالا تو اس میں کتاب تھی وہی لال پیلی ــــ اتفاق سے بیگم باورچی خانے سے نہ جانے کیا چیز لینے نکلی ۔ اس کی جو نظر پڑی تو اس نے دوڑ کر وہ کتاب ان کے ہاتھ سے چھین لی اور کمرے میں گھس گئی ــــ شاہد میاں سمجھ گئے ۔ انہوں نے جو مڑ کر دیکھا تو اماں نیت باندھے کھڑی تھیں ۔ اور عذرا کے چہرے پر ہلکی ہلکی

مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور شاہد میاں اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے ــــــ وہ دھوپ جو تھوڑی دیر پہلے دیوار پر پڑ رہی تھی دیوار کی سپیدی میں گھل کر رہ گئی ــــــ سورج ڈوب گیا تھا اور دھند لکے میں اندھیرا گھُلتا جا رہا تھا۔

اَن دیکھی راہیں

"ہائے اللہ۔ یہ بھی اچھی خاصی مصیبت ہے" سلطانہ جلی بھنی کمرے میں داخل ہوئی اور دھڑام سے مسہری پر جا گری۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا آخر اس کو ہو کیا گیا؟ مجھے غصّہ بھی آیا اور ہنسی بھی ـــــ سلطانہ نے دوپٹہ اتار کر ایک طرف پھینکا ـــــ "گرمی سی گرمی ہے، دم گھٹا جا رہا ہے" اور اس نے آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر پھونکا۔ جیسے اس کی یہ پھونکیں اس گرمی کا خاتمہ ہی تو کر دیں گی۔ چہرہ معلوم نہیں تمازتِ آفتاب سے یا کسی اور وجہ سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا میں نے پھر ایک جھلستی ہوئی نظر سلطانہ پر ڈالی، یا اللہ ـــــ کہاں یہ پردے کی بوبو اور کہاں آج یہ حال ـــــ اونہہ ہوگا مجھے کیا پڑی جو جی میں آئے کرے۔ پھر میں زبردستی دوسری طرف منہ پھیر کر غلاف کاڑھنے لگی اور کتنی دیر اس طرح کاڑھتی رہی۔ ایک

دفعہ جو غور سے دیکھا تو دونوں پھول غلط رنگوں سے کڑھ گئے تھے ——
ایک تو ویسے ہی کپڑا چھلنی ہے اور اب اُدھیڑنے سے اور بھی تار تار ہو
جائے گا۔ میرا دماغ پردے کی چہار دیواری سے نکل کر، دُور —— سڑکوں
میدانوں، تپتے ہوئے کھیتوں —— تنگ و تاریک متعفن گلیوں میں بھٹکنے
لگا —— بچے، جوان، بوڑھے —— مرد، عورتیں، ایک مخلوق جن کے جسم
کپڑوں سے بے نیاز —— مجسّم حیا —— لیکن بے حیائی کی تصویریں —— پر
کیا کریں، کپڑا کہاں سے لائیں۔ وہ معصوم دوشیزائیں جن کے چہرے چاند
تاروں نے بھی نہ دیکھے تھے۔ آج ان کے پاس ایک گز چیتھڑا نہیں کہ اپنا
جسم ڈھانپ سکیں اس لئے کہ وہ اب تنگ و تاریک کوٹھریوں کی زینت بنا
ہوا ہے —— میرا جی الجھنے لگا —— دماغ پھر کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر
غلاف کے دھاگوں میں الجھنے لگا۔ کتنی دیر محنت کی۔ اور پھر اُدھیڑ بُن کرد
پھاڑ میں جائیں ایسے غلاف۔ پھر ایک ہو تو کوئی بات بھی ہے ہو چلو ——
محنت سے کاڑھ دو۔ وہ تو پھر جیسے ہر دن ایک نیا کپڑا چلا آ رہا ہے۔
معلوم نہیں امی کو یہ کیا نیا مرض لاحق ہو گیا ہے۔

"کیوں آپا —— یہ اطہر بھائی تو ہمارے بھائی ہوئے نا"
"ہوں ——" میں نے آہستہ سے کہا اور اس کی طرف گھور کر دیکھا۔
"تو پھر ان سے ایسا پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ امی بھی بس

سنبھیا گئی ہیں" میں خاموش رہی ـــــ آخر کمی بھی کیا. میری نظر پھر ریشم کے دھاگوں پر پڑی - ان کو بغیر ادھیڑے کام نہ چلے گا. بھلا کہیں پتیاں بھی گلابی ہوتی ہیں - اور میں ان گلابی پتیوں کو ادھیڑنے لگی - ایک بار یونہی پھر نظر سلطانہ پر جا پڑی، وہ تو لال انگارہ سی ہو رہی تھی ـــــ میں نے پھر پھول پر نظریں گاڑ دیں اور کچھ دن پہلے کے واقعات ریشم کے دھاگوں کی طرح آپ ہی آپ ادھڑنے لگے. یہی کمرہ تو تھا ـــــ اور آج ہی کی طرح ـــــ جب اطہر بھائی آئے ہوئے تھے - انہوں نے آتے ہی دروازے پر آواز دی. اور امی نے مجھے دیکھا. جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہوں ـــــ ڈربے ـــــ ڈربے ـــــ ڈربے ـــــ جہاں ذرا سلیپر پہننے میں دیر ہوئی اور انہوں نے للکارا ـــــ "بغیر جوتے کے تو بیگم صاحب سے ہلا ہی نہیں جاتا. خصم کے یہاں نرے جوتے ہی تو جڑیں گے ـــــ"

"سجوتے ـــــ جوتوں کی کیا کمی ـــــ اعمال چاہئیں"

سلطانہ پٹاخ سے باورچی خانہ سے بولی ـــــ میں جھنجھلا گئی ـــــ اور یہ امی تو بس ادھر اطہر بھائی کی آواز آئی اور ان کے تو جیسے ڈول کا پانی نکلا ـــــ میرا دل آپ کباب ہو رہا تھا اور پھر دیکھوں تو پیچھے سے سلطانہ چلی آرہی ہیں ـــــ گرتی پڑتی ـــــ اس ہرن کی طرح جس کا شکاری کتے پیچھا کر رہے ہوں -

آپا ـــ وہ ـــ اطہر بھائی آئے ہیں"

"تو میں کیا کروں ـــ بس آگئیں کان کھانے" مگر میرے اس ترش جملے پر بھلا سلطانہ چپ رہنے والی تھی!

"میں باورچی خانے میں تھی ـــ کسی نے بتایا بھی تو نہیں۔ کتنی دیر دھوئیں میں گھٹتی رہی، امی بھی تو ادھر نہ آئیں جو اُن سے پوچھ لیتی کہ کدھر بیٹھے ہیں۔ آخر خود ہی جھانک کر دیکھا۔ وہ فرید کی دوربین دیکھ رہے تھے۔ بس میں جھپٹ کر کمرے میں گھس آئی"۔

سلطانہ تھوڑی دیر خاموش رہی اور متوقع نظروں سے مجھے گھورتی رہی کہ میں بھی کچھ اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں۔ مگر مجھے خاموش دیکھ کر سلطانہ سے چپ نہ رہا گیا ـــ

"اور آپا ـــ یہ امی کو دیکھو فرماتی ہیں ـــ سلطانہ بیٹی تو کہاں جا رہی ہے۔ یہ دیکھو بھیا آیا ہے۔ بس ایسی باتیں کرتی ہیں کہ غصہ ہی آتا ہے"۔

پھر وہ اطمینان سے بیٹھ گئی ـــ اس کے سانس کی تیزی بھی کم ہو گئی تھی۔

"مگر تجھے کیا پڑی ہے پردہ کرنے کی" بغیر بولے میرا جی بھی نہ مانا۔

"نہیں تو کیا سب کے سامنے پھروں" وہ جھنجھلا گئی۔

"ہاں اب تو جوان ہو گئی ہے نا" میں نے بھی جل کر کہا۔ پھر وہ چپ ہو گئی شاید یہ سوچ کر کہ کون ان کے منہ لگے۔ مگر یہ لونڈیا بھی عجیب چیز ہے۔ جہاں جاؤ سایہ کی طرح ساتھ ــــ اندھیرے میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مگر کیا مجال جو ایک لحہ کے لئے بھی پیچھا چھوڑ دے۔

پھر اطہر بھائی کے بولنے کی آواز سنائی دی ــــ ان کی باتیں تو جب سنو جب بھائی جان ہوں۔ بھلا ان امّی سے کیا باتیں کریں جن کے منہ میں دانت تک تو ہیں نہیں۔ پھک ــــ پھک تو بولتی ہیں ــــ کیا اچھا ہوتا جو میں پردہ نہ کرتی ہوتی ــــ مگر یہ امّی ایسی بھولی کہاں، سچ مچ کتنی باتیں کیا کرتی اطہر بھائی سے۔ اور پھر تو وہ بھی امّی سے بات نہ کرتے۔ کیا مزا آتا ہو گا بیچاروں کو۔ مجھے تو سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ ان بڑھیوں کی باتیں بھی کیا۔ جیسے بگڑی ہوئی پن چکی ــــ پھکر ــــ پھکر کر رہی ہو۔

اطہر بھائی نہ جانے اب بھی مجھے یاد کرتے ہیں ــــ کہتے کیوں نہ ہوں گے پر کس سے کہیں۔ وہ کیا جانیں میں کتنا یاد کرتی ہوں ــــ ہزار جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر کواڑ کی درار سے جھانک لوں۔ پر یہ بڑکھی جو بیٹھی ہیں۔ پرمے کی بوبو۔ ان کی جوانی تو ابھی سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ یہ نہیں کہ بچوں کی طرح کھیلتی پھرے۔ یہی تو کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ پھر تو آپ ہی گھٹ گھٹ

کر مرنا پڑے گا۔ تب پتہ چلے گا دال آٹے کا بھاؤ۔ ابھی تو شوق میں مری جا رہی ہیں" ـــــ مجھے اس کی ان حرکتوں پر غصہ بھی آتا ہے اور بعض وقت ہنسی بھی۔ چار انگل کی تو ہیں آپ، ابھی سے پردہ۔ میرا بس چلے تو اس کا منہ ہی کچلوں ـــــ بڑے اطمینان سے پڑی ہوئی ہیں جیسے اس لڑائی کی فتح کا سہرا انھیں کے سر تو بندھا ہے۔

"کیوں آپا ـــــ یہ برقعہ کے گز میں بنتا ہے؟"

میں نے چپ سادھ لی ـــــ پھر اسے کہاں چین۔ "کتنے دن سے امی سے کہہ رہی ہوں کہ برقعہ بنوا دو مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، ان کے حساب چاہے ننگی پھروں"

مجھے پھر غصہ آیا جیسے آپ بڑی ننگی ہی تو پھر رہی ہیں۔ اچھا ہے بی بی۔ جب تک یہ مصیبت نہیں آتی ـــــ صبح شام بس یہی رٹ لگی رہتی ہے۔ برقعہ نہ ہوا کھیل تماشہ ہو گیا۔ جہاں امی بیٹھیں وہیں برقعہ کا ذکر ان کے موڈ کا بھی تو لحاظ نہیں کرتی کہ وہ جلی بھنی چولھے کے سامنے سے آ رہی ہیں۔ اور یہاں بس "بس امی پانچ گز کپڑے میں ہو جائے گا۔ حد سے حد پندرہ روپئے لگیں گے۔" پندرہ روپئے کچھ ہوتے ہی نہیں۔ اور وہ بھی نگوڑے برقعہ کے لئے۔ کوئی اچھی چیز ہو تو ایک بات بھی۔ پہننے کو تو ڈھکا نے سے کپڑا ملتا نہیں۔ اور ان کے برقعہ کے لئے۔ کہاں سے آئے پانچ گز کپڑا۔

اطہر بھائی بتلا رہے تھے کہ جس طرح بنگال سے چاول اڑ گیا تھا۔ اسی طرح اب کپڑا ناپید ہو گیا ہے۔ میرے اللہ یہ چیزیں کہاں چلی جا رہی ہیں۔

"آپا ۔۔۔ آپا" میں چونک پڑی

"کیا ہے" ۔۔۔ اور اس روز رضیہ نے کتنی مرتبہ آدمی بھیجا۔ چلی کیوں نہیں گئیں؟"

"تو تم ہی چلی جاؤ نا" ۔۔۔ "میں تو اس طرح کھلے بندوں نہیں جاتی۔ میں تو اللہ قسم دروازے کے باہر قدم نہ رکھوں"۔

دیکھو تو اس لڑکی کو کیسے بڑھ بڑھ کر باتیں بناتی ہے۔ جیسے میں دن بھر پھرتی ہی تو رہتی ہوں۔ ادھر امی کی یہ حالت ہے کہ دروازے تک تو جانے نہیں دیتیں۔ ذرا نظر سے ہٹی اور انھوں نے چلی پکار لگائی۔

"نعیمہ ۔۔۔ کہاں چلی گئی، جب دیکھو جب دروازہ میں ٹنگی رہتی ہے۔ بہو بیٹیوں کے یہ طور طریقے بھی کہیں دیکھے ہیں"۔ ایک منٹ کے لئے جا کھڑی ہوئی تو جیسے دن بھر ہی تو دروازے میں ٹنگی رہتی ہوں۔ جیسے مجھے اور کوئی کام ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہیں گئی تو رضیہ کے گھر تک ۔۔۔ وہ بھی بڑی مشکل سے۔ امی گھر سے باہر تو قدم رکھنے نہیں دیتیں۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ چاہے کچھ ہو۔ آج تو رضیہ کے یہاں

اکیلی جاؤں گی۔ جھٹ میں نے برقعہ اٹھایا اور چل پڑی۔ مگر وہ تو میرے دم کے ساتھ ہے ایک سیکنڈ کو جو پیچھا چھوڑ دے۔ دیکھوں تو پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں کھسڑ ـــ کھسڑ کرتی ہوئی۔

"اب کیوں چلی آئیں ـــ؟" میں نے جل کر کہا۔

"تو کوئی بے پردہ تھوڑا ہی آ رہی ہوں۔ امی کا برقعہ لے کر آئی ہوں دیکھتی نہیں ہو ٹانگوں میں لٹکا ہوا ہے۔"

"ہاں ـــ" میری رفتار میں جتنی تیزی آتی جاتی تھی اتنا ہی وہ تیزی سے دوڑنے لگتی۔ اور میرے برابر آ جاتی۔ غصہ میں آکر میں نے بات تک نہیں کی۔ میں آپ ہی جا رہی تھی ـــ میں نے نقاب الٹ دیا ـــ

"میں بھی نقاب الٹے دیتی ہوں۔ کوئی آ تھوڑا ہی رہا ہے" اس نے نقاب الٹتے ہوئے کہا۔ جیسے ساری دنیا کی جوانی انہیں پر تو پھٹی پڑ رہی ہے۔ جمعہ ـــ جمعہ آٹھ دن کی تو ہوئی نہیں اور ابھی سے یہ حال ہے گھر میں اچھی خاصی آفت مچا رکھی ہے۔ جب تک یہ بڑی بی اندر نہ چلی جائیں کیا مجال جو کوئی گھر میں پر بھی مار لے۔ جیسے کوئی آئے گا بس تو انھیں کو دیکھنے کے لئے، اور جب سے یہ پردے کا ڈنکا بجا ہے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ اطہر بھائی آئے اور آپ جھٹ اندر، کبھی جی چاہے تو جھانک بھی تو نہیں سکتی۔ میرا جی الجھنے لگا۔ یہ نہ ہوتی تو دیکھتی۔ ان کی آنکھیں تو سچ مچ جب

وہ اپنا منہ ایسے میں گویا کوئی شعر گنگناتے ہیں تو جیسے ادھ کھلی سیپیاں ۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کتنے سپنے چھلک جاتے ہیں۔ بہت جی چاہتا کہ دیکھوں پھر سلطانہ کو دیکھ کر ہمت نہ پڑتی۔ اور میں پھر سر جھکا کر اپنے کام میں لگ جاتی۔

"کیا بات ہے سلطانہ ـــ آج تو بڑا غصہ آرہا ہے"۔ مجھے اس پر کچھ رحم سا آیا۔

"تمہیں کیا ـــ تم اپنا کام کرو ـــ" یہ کہہ کر سلطانہ نے پھر دوپٹہ سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

آج تو یہ حال ہے اور اس روز ـــ میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی تصویر پھر گئی۔ جب ہم دونوں جتنے ہی ایک دوسرے کے نزدیک تھے اتنے ہی دور بھی۔ میں غصہ میں چلی جارہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی۔ اتنے تیز کہ اکثر قدم ڈگمگا جاتے۔ زمین آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی جیسے وہ بھی غصہ سے لرز رہی ہو۔

"آپا ـــ دیکھو کوئی آرہا ہے۔ نقاب ڈال لو"

"آنے دے ـــ تو نے ڈال لیا، بس کافی ہے"۔ میرا غصہ اور بڑھ گیا "ہونے دو کوئی ہوگا تو کیا کرے گا۔ دیکھ ہی تو لے گا بس" ـــ ویسے تو میں ہمیشہ نقاب ڈال لیتی تھی۔ کم از کم اس میں یہ تو فائدہ ہی ہے کہ ہم سب کو دیکھیں اور ہمیں کوئی نہ دیکھے۔ مگر یہ بھی تو بُرا ہے ـــ مجھے بھی ضد ہوگئی تھی

کچھ بھی ہو آج ایسے ہی جاؤں گی۔ چاہے طالب علموں کا پورا قافلہ ہی سر پر کیوں نہ آجائے۔

"آپا ——— اب تو مکان بہت ہی قریب آگیا۔ تمہیں کیا ہوگیا؟ امی سنیں گی تو کیا کہیں گی؟" میں چونک پڑی۔ خیالات کو دھچکا لگا، جیسے ریل گاڑی چلتے چلتے یکبارگی رک جائے۔ سچ مچ یہ لڑکی بڑی وہ ہے۔ کہیں امی سے نہ ٹانک دے۔ جیسے پھر آپ ہی نقاب سرک جائے۔ چاند وہیں تھا پر بادل اس پر خود ہی سرک آیا۔ آگ پر پانی پڑ چکا تھا۔ آنچ ختم ہو گئی تھی۔ صرف دھواں ہی دھواں نظر آرہا تھا۔ میرا غصہ شرمندگی سے بدل چکا تھا۔ میں خاموش چلی جارہی تھی۔ دماغ میں سکون تو نہ تھا پر ایسا خلا جس کو پُر کرنے کے لئے کوئی خیال قریب آنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا ——— میں اسی طرح چلتی رہی۔

"آپا۔ آج تمہیں کیا ہوگیا کتنی دور نکل آئیں۔ اب یہاں کون دھرا ہے جو آپ نقاب ڈالے چلی جارہی ہیں۔" سلطانہ نے بات کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سامنے رضیہ کا مکان تھا۔ میری عجیب حالت تھی ——— یہ لڑکی ——— میں نے گھور کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اور تیزی سے مکان میں گھستی ہوئی رضیہ کے کمرے میں چلی گئی۔

"آہا — ہا — بہن تم آگئیں، کتنی دیر سے تم دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ انجم اور نسیمہ آئی ہوئی ہیں، سب ہی تو تمھیں پوچھ رہی تھیں"۔ یہ کہتے ہوئے رضیہ سلطانہ کو لپٹ گئی۔ "اور تو بھی نخرے کرنے لگی لونڈیا — او ہو — برقعہ ہلاتی ہوئی آئی ہیں بڑی بی"۔ مجھے ہنسی آگئی۔ سلطانہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ میرا جی چاہا کہ خوب زور سے قہقہہ لگاؤں۔

پھر اس نے برقعہ ایک طرف کو ڈال دیا، اور کرسی پر جم کر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ نیچے کو سرک گیا۔ وہ جھینپ گئی اور اٹھا کر آہستہ سے سر پر ڈال لیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں وہ جھینپی جھینپی سی ہو رہی تھی، اس نے اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ سنوارنے سنوارتے بھی بالوں کی ایک لٹ چہرہ پر بکھر گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پسینے میں شرابور ہو گئی اس نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا پھر سر پر جما لیا۔

"آپا — آخر کب تک گھٹے پڑے رہیں۔ کوئی حد بھی ہے اس پردہ کی"۔

جیسے ایک دم مجھے کسی نے غار میں دھکیل دیا۔ ماضی کے سپنے ٹوٹ چکے تھے۔ میرے سامنے سلطانہ مسہری پر لیٹی تھی۔ دوپٹہ ایک

طرف پڑا ہوا تھا اور وہ اپنے شانوں کی مچھلیوں کو گھور رہی تھی میری نظر ملتے ہی وہ جھینپ سی گئی، آج پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ اب سلطانہ وہ سلطانہ نہیں ہے۔

اتنے میں امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"لے سلطانہ یہ تیرا برقعہ سل گیا ہے"

سلطانہ نے اٹھ کر برقعہ لے لیا۔ امی جس تیزی سے داخل ہوئی تھیں اسی فراٹے سے نکل گئیں۔ میں نے برقعہ دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سلطانہ نے اسے دور پھینکا۔

"یہ پردہ —— پردہ —— ناک میں دم آگیا اس پردے سے تو۔" اور سلطانہ چارپائی پر الٹ گئی۔ میں آہستہ سے دروازہ کے پاس گئی، جھانک کر دیکھا۔ تو اطہر بھائی سامنے لیٹے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

"کیوں آپا —— اطہر بھائی گئے؟" یہ کہتے ہوئے جھٹ اٹھی اور دروازہ سے جھانکنے لگی ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں کے پڑے ہوئے نقاب اٹھ گئے ہوں۔ سامنے سے بادل کا ٹکڑا ہٹ گیا تھا۔ ہر چیز صاف شفاف جیسے سورج کی گرم گرم کرنوں نے زمین اور آسمان کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہو۔

فاختہ

آج نہ جانے کتنے دنوں کے بعد اس کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آرہے تھے ورنہ عام طور پر اس کا چہرہ بالکل سادہ اور بے معنی سا ہوتا جس پر اُداسی کی ایک ہلکی سی تہہ تو ضرور ہوتی مگر یہ اُداسی تو اس کے چہرے کا ایک حصہ بن چکی تھی اس لئے اس میں کوئی معنی نکالنا بھی زیادہ مناسب نہ تھا۔ یا پھر یوں سمجھئے کہ اُداسی، اس کی دوسری عادت سی بن گئی تھی مگر آج تو اس کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آرہے تھے جیسے ساری دنیا کی فکر اس کی آنکھوں میں آکر سما گئی تھی، اس کے ہونٹوں پر ذرا بھی تو مسکراہٹ نہ تھی بلکہ ان گھنی پلکوں میں تو جیسے کوئی گہری فکر جھانک رہی تھی، وہ نہ جانے کہاں تھی، کس دنیا میں تھی۔ آنگن میں بچوں کا شور کبھی کبھی اس کے دماغ میں تالیاں سی بجا کر خاموش ہو جاتا۔ کھڑکی سے آنے والی گرم گرم ہوا اس

کے کھلتے ہوئے بالوں کو اس کے منہ پر بکھیر دیتی۔ اور وہ دونوں ہاتھوں
سے جھٹک کر ان کو پھر پیچھے ڈال دیتی —— مگر یہ ہوا اس کے خیالات
کو منتشر نہ کر سکتی تھی۔ بظاہر اس کی نظریں گلدان کے تازہ پھولوں پر
جمی ہوئی تھیں مگر وہ رنگ و بو کی اس دنیا سے بہت دور ہوتی، یہ گلدان
کے تازہ پھول اس کی آنکھوں میں شگفتگی نہ پیدا کر سکتے۔ وہ خیالات
کے پروں پر اڑتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی سہانا خواب ہو۔ ہاں
خواب ہی تو تھا، کاش یہ خواب ایک بار حقیقت بن سکتا۔ اس کے
کان تاروں کی جھنجھناہٹ کو ترس گئے۔ وہ تار جو آخری بار جھنجھنا سے
اور پھر سب ہی تو ٹوٹ گئے۔ پھر ساز تا ساز میں کیا رہ گیا۔ لکڑی کا ایک
جھنجھنا، مگر وہ سوچ رہی تھی۔ کاش اس لکڑی کے جھنجھنے سے ہی
کوئی نغمہ پھوٹ پڑتا —— اور کان لگانے پر ہلکی سی جھنجھناہٹ
سنائی دیتی۔ کتنا اچھا ہے میری منّی کا جھنجھنا۔ جس میں کوئی تار نہیں
محض کنکر ہے مگر کیسا بجتا ہے جیسے بین کے سُروں پر سانپ
لہرا رہا ہو۔

پھر یہ نغماتی خاکے دھندلے دھندلے ہو کر ہوا کی لہروں میں
غائب ہو رہے تھے۔ مگر رضیہ اُن کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ وہ ان لہروں
کو پکڑنا چاہتی تھی مگر ہوا کی یہ لہریں کہیں کسی کے ہاتھ آتی ہیں۔ فہیم

بھی تو ان ہوا کی لہروں کی طرح آیا اور غائب ہو گیا۔ مگر رضیہ دیکھتی رہی ـــــ

"امّی ـــــ میرا جھنجھنا دیکھو" منّی نے اپنا جھنجھنا اس کے منہ میں ٹھونس ہی تو دیا۔

"دیکھ تو رہی ہوں" اس نے بغیر اس جھنجھنے پر نظر ڈالے ہی جواب دیا۔

امّی وہ باہر وردی میں سپاہی جا رہا ہے" منّی نے اسے متوجہ کرنے کے لئے دوسری بات کہی۔

"جانے دو" اس نے دور آسمان کے خلا میں نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"امّی ـــــ ہمارے ابا کہاں ہیں؟"

اور اب تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی منّی نے اسے بالوں سے گھسیٹ کر وہاں سے ہٹا دیا۔ خواب و خیال کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا۔

"بیٹی وہ آ ئے گا لڑائی لڑنے گیا ہے ـــــ بڑے زبردست دشمن سے لڑائی جیت کر آئے گا" ـــــ اس نے یہ بات کہہ دی مگر اس پانی کے ایک قطرے کو کیسے روکتی جو اس کی دونوں پلکوں پر دبا نے

کے باوجود نکل بھاگا، مگر منّی اس نظرے کو کیا سمجھتی۔ پانی کا ایک قطرہ ہی تو تھا اور پھر اسے فکر تو جب ہوتی جب اس کا باپ نہ آتا مگر وہ توڑ لائی جیت کر ہی آئے گا۔ وہ اس قطرے سے کیا مطلب نکالتی ——

رضیہ نے دوپٹے کے پلّو سے اسے پونچھ ہی تو ڈالا جیسے اُسے گرنے سے بچا لیا اور پھر وہ آسمان کے بے رنگ خلا کی جانب دیکھنے لگی۔ ذرا اسی دیر میں فہیم اس کے سامنے مسکراتا ہوا چلا آیا ——

"رضیہ —— میری رضیہ ——" جیسے اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور رضیہ شرما گئی۔ اور اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا وہاں کوئی بھی نہ تھا —— اس کی منّی، اپنی روئی کی سفید چڑیا لئے کھڑی تھی —— اور وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ خیالات کے سمندر میں پھر سے غوطے لگانے لگی —— ماضی کے ٹوٹے ہوئے سپنوں کو جوڑنے لگی، بکھرے ہوئے حال کو جیسے سمیٹ رہی ہو —— مستقبل کی کلیوں کی طرف ہاتھ چلاتی جا رہی تھی۔ مگر وہ کلیاں تو جیسے اس کے ہات سے چھوٹی جا رہی تھیں۔ اور وہ سوچنے لگی کہ یہ مستقبل اس کی گرفت سے باہر تھا —— وہ خیالات کے پروں کے سہارے اُڑ رہی تھی اور ہوا کے دوش پر یسراج کے تار جھنجھنا رہے تھے اُس نے اس طرح آنکھ کھولی جیسے ابھی سو کر اٹھی ہو۔ اُس نے آنکھیں ملیں اور ایسا معلوم

معلوم ہوا جیسے کوئی بوجھ اس کے ذہن کے سامنے سے اُٹھ گیا ہو — فہیم اس کے سامنے مسکراتا ہوا اکڑتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ کتنا صحت مند جسم ہے اس کے شوہر کا۔ کشادہ سینہ اور یہ بھرا بھرا جسم — اس نے اپنی منی کو اپنی گود میں اٹھالیا اور خوب بھینچ کر پیار کیا اس کے جی میں تو آیا کہ اپنی منی سے کہہ دے "دیکھ وہ تیرا ابا بیٹھا ہے" — مگر وہ تو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کتنا گانے کا شوق تھا اس کے فہیم کو — کچھ خاکے اس کے ذہن کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ جیسے پچھلے ماہ و سال رقص کرتے چلے جا رہے تھے۔

جھوم جھوم بدریا جھک آئی
اب کیسی گھنگھور گھٹا چھائی

رضیہ کو اس وقت کتنی ہنسی آئی تھی۔ مئی جون کی گرمی تھی، لو کی لپٹیں تھیں، جو بدن کو جھلسائے دے رہی تھیں اور آپ گا رہے تھے "جھوم جھوم بدریا جھک آئی" — معلوم نہیں گرمی کی اس تیز دھوپ میں بدریا کہاں چھپی تھی، جو برس ہی تو پڑے گی — بڑے تان سین ہی تو ہیں — رضیہ جھٹ اٹھ کر فہیم کے پاس پہنچ گئی تھی۔ فہیم جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ جیسے وہی بدریا ہے جو جھوم جھوم کر برس ہی تو پڑے گی۔ "کیا ویپک گا رہے ہو" رضیہ نے فہیم کے کاندھے پر اپنا ہات رکھ دیا۔ اور اسی لمحے اس کا دوپٹہ ڈھلک گیا تھا۔ مگر فہیم اپنی دھن میں تھا

بادل اس کے ارد گرد منڈلار ہے تھے۔ اور رضیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی مگر اس ایک لمحہ کی چمک نے اس کی آنکھوں کو تر کر دیا۔ مگر پھر وہ آواز سنسناتی ہوئی اس کے جسم میں پہنچ گئی۔ اس نے اپنی رگوں میں اینٹھن سی محسوس کی۔ نہ جانے یہ گانے کی تاثیر تھی یا اس کے بول تھے۔ جو اس کے سینے میں اترتے چلے گئے۔

بجری کی چمک، بادل کی گرج

اب مند مندیوں چلت پروائی

نہیم نے انترا اٹھایا اور جیسے کان ہی تو پھٹ گئے، سوائے نہیم کے گانے کے اور کچھ سنائی بھی تو نہیں دے رہا تھا اور پھر وہ "جھوم جھوم" اس کے سم پر آکر رک گیا۔

یہ تو سچ مچ دیپک تھا" رضیہ بولی

"یہ دیپک تھا!۔۔۔" نہیم کے ماتھے پر کتنی ہی تو لکیریں پڑ گئیں

۔۔۔"جاہل کہیں کی ۔۔۔ یہ ملہار تھا۔۔۔ برساتی راگ بی تالا"

"تو یہ برسات ہے"

"برسات نہ سہی پر راگ تو برساتی ہے۔ کیا موسم کے ساتھ راگ بھی بدل جاتے ہیں"

مگر یہ تو بے وقت کی راگنی ہو گئی۔ اتنی سخت دھوپ، لو، گرمی۔

اور آپ گا رہے ہیں" جھوم جھوم بدریا جھک آئی" اس گانے سے تو اور آگ برسنے لگی۔

"اچھا سہاگ گاؤں، تجھے تو بس سہاگ ہی پسند آئے گا۔ سچ کہتا ہوں رلا دوں گا۔ کیا کوئی مرثیہ گائے گا جو میں سہاگ گاؤں گا۔۔۔

"تو پھر میں کیا کروں" رضیہ چڑھ سی گئی۔

کروں کیا تیری شادی میں گاؤں گا۔ ایسا گاؤں گا کہ ساری محفل سسکیاں لینے لگے گی اور تو تو بس دہاڑیں مارے گی"۔۔۔

اور آپ نہیں روئیں گے۔"

میں کیوں روتا۔ روئے میری بلا۔ میں تو خوش ہوں گا اور گاؤں گا جھوم جھوم کر"

"لکھیا بابل، نھیرا چھوٹ ہی جائے"

مگر اب تو وہ انگلیوں میں دوپٹہ کا پلّو مروڑ رہی تھی اور چپ تھی اس کے روکتے روکتے بھی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک ہی تو پڑے اور فہیم چونک گیا۔۔۔"

"رضیہ" فہیم نے اس کی ٹھوڑی میں ہات لگا کر منہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس نے سر کو اور نیچے گرا دیا۔۔۔

"رضیہ" اب وہ ایسراج ایک طرف رکھ کر اس کے قریب آکر بیٹھ

گیا، رضیہ کیوں رونے لگی، وہ یہ بھی تو نہ سمجھ سکا، اس کے مذاق سے بُرا مان گئی۔ مگر مذاق تو وہ ہمیشہ ہی کرتا تھا۔ اور رضیہ کبھی اس کے مذاق سے چڑھتی بھی نہ تھی۔

"رضیہ ـــ اچھا ہے خوب رولے' یہ گالوں کی سرخی تو دھل جائیگی ـــ اچھی نہیں لگتی مجھے یہ سُرخی ـــ"

"کیسی سُرخی ـــ" وہ کھسیانی ہو کر رہ جاتی۔

"یہ گالوں کی سرخی" اور فہیم اس کے گالوں پر انگلی پھیرنے لگتا۔ "ارے یہ کیسی سُرخی ہے جو چھوٹتی نہیں؛

یہ سرخی کب ہے"

"اچھا تو یہ تمہارا رنگ ہی ایسا ہے، میں تو سمجھا تھا کہ سرخی لگائی ہو۔ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اس روز تو میرا ارادہ تھا کہ پانی میں کپڑا تر کر کے پونچھ ہی تو ڈالوں اس سُرخی کو" پھر وہ شرارت سے مسکراتا۔

مگر وہ تو پھر رو رہی تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملہار کے برساتی راگ جھوم جھوم کر اس کے اِردگِرد منڈلا رہے ہیں۔

"نہیں بتاؤگی رضیہ ـــ شادی کی بات پر ناراض ہو گئیں۔ اچھا جاؤ وعدہ کرتے ہیں آج سے شادی کی بات نہیں کریں گے۔ بس اب

چپ ہو جاؤ نہیں تو بلاتا ہوں اماں کو"۔ فہیم نے دوسری چال چلی اور اب تو وہ کامیاب ہو گیا۔

"رضیہ بیٹی جا کباب تل لے" اماں بی جوتے کے لیتڑے گھسیٹتی ہوئی دروازے تک آئیں اور پھر واپس چلی گئیں۔

رضیہ خاموشی سے اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دی اور اس وقت وہ اٹھنے کا بہانہ بھی تلاش کر رہی تھی۔ وہ فہیم کے سامنے بیٹھنا بھی تو نہ چاہتی تھی اس کا دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس کو موقع ملتا اور وہ کھل کر رو ہی سکتی۔ نہ جانے اسے رونے سے کیوں شرم آنے لگی تھی اور پھر جب کہ اماں بی کا یہ عالم کہ جب کوئی علیحدہ ہوتا تو خوب ہی ٹوہ لیتیں۔ اور خاص کر جب فہیم جاتا تو پھر کچھ نہ پوچھو اُن کی کیا حالت ہوتی ـــــ لیکن رضیہ کی تو عجیب ہی کیفیت ہوتی پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں لگ جاتی اور جب فہیم چلا جاتا تو وہ کوٹھری میں پہنچ کر کوئی کتاب اٹھا لیتی اور پھر اس کی آڑ میں خوب ہی توجہ سے کھول کر روتی۔ مگر ذرا سی آہٹ ہوتی اور اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور کتاب کے حروف پھیلے پھیلے سے اس کی آنکھوں کے سامنے رینگنے لگتے۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ مگر پھر وہ اُلجھ سی جاتی۔ آخر اس رونے میں کیا برائی ہے۔

اماں جی بھی روتی ہیں اور رشو کا بھائی جب جاتا ہے تو وہ کیسا روتی ہے اور اس کا بھائی جاتے ہوئے اس کو پیار کرتا ہے مگر اس پیار سے وہ کبھی اسے بہلا نہیں سکتا۔ وہ تو اور بھی دہاڑیں مار مار کر روتی ہے مگر نہ جانے کیوں وہ رشو کی طرح کھل کر نہ رو سکتی۔ اور فہیم تو اسے جاتے وقت بھی نہ پوچھتا۔ بس وہ توکوٹ کاندھے پر ڈال کر چل دیتا۔ جیسے پرندہ اڑنے کے لئے پر تولے بیٹھا ہے۔ موقع ملا اور پھُر۔ بچاری دادی اماں کو تو اُٹھتے اُٹھتے ہی پانچ منٹ لگ جاتے۔ ۔۔۔ کیسا بے حس ہے۔ دوسروں کے جذبات کا تو کچھ بھی خیال نہیں کرتا، مگر وہ خط کیسے مزے سے لکھتا ۔۔۔

"میری رضیہ یہاں بالکل جی نہیں لگتا۔ سب یاد آتے ہیں۔ بچوں کا کھیل کود ۔۔۔ اماں کا غصہ اور بجیا کی باتیں۔ یہ سب ہی تو آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں۔"

"اور میری کوئی بات بھی یاد نہیں آتی" ۔۔۔ رضیہ جھنجھلا کر رہ جاتی۔ اور وہ خط پڑھ کر تکیے کے نیچے چھپا کر رکھ دیتی۔ جیسے کوئی بڑے راز کی چیز ہی تو ہے مگر اس کے خیالات کا سلسلہ نہ ٹوٹتا اور وہ سوچتی ہی چلی جاتی ۔۔۔ آخر میرے نام خط لکھنے کی ضرورت ہی کونسی تھی جو میں یاد نہیں آتی۔

اور وہ طے بھی کرلیتی کہ اب ان کو خط نہ لکھے گی۔ مگر پھر نہ جانے کیوں ایسا نہ کرسکتی۔ نہ جانے اس کے دماغ میں آندھیاں سی کیوں چلنے لگتیں جیسے وہ کسی طوفان میں ہی چلی جارہی ہو۔ کتنے سنسان ہیں یہ میدان جن میں پیپل کے پتوں کی اداس اداس کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیتا، اور وہ بھی کتنی مجبور ہے جو اس اداسی پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔

پھر اس کو نعیم پر غصہ آیا۔ کتنے بے حس ہیں جن کو موسیقی کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کوئی آواز ان کے کان تک نہیں پہنچ پاتی۔ مگر موسیقی سے تو اسے بھی محبت ہے۔ پیلو کی تانوں پر کس بری طرح وہ سر دھنتی ہے۔ لیکن نعیم، نہ جانے کہاں ہوگا، کس سنسان بستی میں، جہاں اب نہ موسیقی کا گذر ہوگا، نہ ملہار کے برساتی راگوں کی پہنچ، اور نہ جانے وہ ہو یا نہ ہو۔

لیکن نعیم چلا گیا۔ شادی کے ایک مہینہ بعد ہی چلا گیا۔ اور سارے گیت اور نغمے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ رضیہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی، اس کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیئے ہوں۔ وہ کیا کچھ نہ کہنا چاہتی تھی، مگر کچھ بھی تو نہ کہہ سکی ـــــ اور وقت یوں ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتا چلا گیا۔ مگر وہ کیسے روکتی۔ اور اب تو جیسے آنکھیں پتھرا گئی تھیں ـــــ وہ اگر سب کے سامنے بھی روئے تو اس کو کون روک سکتا ہے۔ وہ کسی سے شرما بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ نعیم پچھلے دنوں کی طرح اسے ملہار

راگ ہی سناتا، مگر اس وقت دیپک کے بول اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ سارا جسم جھلس رہا ہے اور آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں جس کو وہ ملہار کے نام پر نچھاور کر دیتی۔

"رضیہ —— میں جلد آؤں گا، جیسے ہی نوکری ملی، میں فوراً آؤں گا، میں اس بچے کے لئے جا رہا ہوں جو ابھی دنیا میں آیا نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آرام سے رہ سکے —— آخر ہمیں اپنے لئے نہیں تو اُس معصوم فاختہ کے لئے تو نوکری کر لی ہی ہے"۔

اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ اور فہیم ان بوندوں کو دیکھتا ہوا چلا گیا، نوکری کی تلاش میں، اپنے بچے کے لئے نئی زندگی کی سہولتیں خریدنے کے لئے۔

اور پھر وہ فوجی لباس میں آیا۔ اُس میں بلا کی پھرتی آ گئی تھی۔ جیسے کسی نے اس کے بدن میں بجلیاں بھر دی ہوں۔ رضیہ چونک ہی تو پڑی۔

"یہ خاکی وردی کیسی؟"

"اب میں فوجی ہو گیا ہوں۔ یہ دیکھو میرے بازو" اور رضیہ چونک پڑی۔ اس لئے کہ ان بازوؤں میں تارے لرز رہے تھے۔ "یہ کیسے تارے؟" وہ گھبرا گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے۔

اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی اجنبی تھا۔ وہ کوئی غیر تھا اور جیسے رضیہ نے آج سے پیشتر اس کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا ــــ مگر دوسرے ہی لمحے اس کو وہ اپنا فہیم ہی معلوم ہوا، اور اُس کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔

"کیا تم فوج میں بھرتی ہو گئے!" اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین سے کوئی جھنکار پیدا ہوئی ــــ اور وہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

اور امی نے اس کی بلائیں لیں، دن دونی رات چوگنی ترقی کی دعائیں دیں ــــ سات سمندر پار اس کی حفاظت کرنے کے لئے امام ضامن کو سونپ دیا۔

پھر وہ چلا گیا اور کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ وہ لڑائی کے میدان میں پہنچ گیا ہے۔

رضیہ ایک خوبصورت سی بچی کی ماں بھی ہو گئی تھی۔ اور اب صرف رضیہ ہی نہیں انتظار کر رہی تھی بلکہ ایک معصوم بچی بھی اس انتظار میں شریک تھی ــــ

لیکن اچانک یہ خبر آئی کہ وہ لڑائی میں مارا گیا ــــ فہیم مر گیا اور اس کے ساتھ وہ تمام آرزوئیں بھی مر گئیں جن کی پرورش رضیہ

نہ جانے کتنے دنوں سے کر رہی تھی۔

وہ روئی، چیخی، چلائی، اور نہ جانے کتنے دنوں اسی طرح تڑپتی رہی۔ لیکن فہیم واپس نہ آیا۔ اور رضیہ نے مجبور ہو کر صبر ہی کر لیا۔

لیکن آج پھر اُداسی کی ایک لہر اُس کے چہرے پر دوڑ گئی ـــــ منّی نہ جانے کتنی دیر سے باہر کھیل رہی تھی اچانک ایک چیخ کی آواز سُنائی دی، رضیہ دوڑی ہوئی گئی۔ دیکھتی کیا ہے کہ منّی دہاڑیں مار مار کر چیخ رہی ہے۔ اور ایک کُتّا اس کی چڑیا لئے بھاگ رہا ہے۔ وہ بے ساختہ پاگلوں کی طرح کُتّے کے پیچھے دوڑی۔

"ابھی لاتی ہوں تیری چڑیا، مت رو بیٹی"۔

کُتّے نے چڑیا چھوڑ دی تھی۔ لیکن اس کے دانت اس پر کچھ اس طرح لگے تھے کہ کپڑے میں سوراخ ہو گیا تھا۔

منّی خاموش ہو گئی۔

بیٹا لو یہ فاختہ ـــــ اب احتیاط سے رکھنا، کُتّے اس کے دشمن ہیں ـــــ اور وہ پھر ان ہی یادوں میں کھو گئی ـــــ ان رومان آفریں ماضی کی گود میں ـــــ جو رنگین بھی تھا اور

بھیانک بھی — اور منی اس کی گود میں پڑی سونے کی تیاری کر رہی تھی — "میری حسین فاختہ" رضیہ نے آہستہ سے کہہ کر اُسے پیار کر لیا۔ "مت رو مار ڈالوں گی۔ اس کتے کو بڑا آیا کہیں کا، ہماری فاختہ کو مارنے"

تارے لرز رہے ہیں

صفی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کتابیں پٹک دیں، میں چونک پڑی۔ کیا ہوگیا اس صفی کی بچی کو۔ اور پھر فوراً ہی اماں کی آواز سارے کمرے میں کچھ اس طرح گونجی جیسے آندھی آرہی ہو۔ اور اُن کے قدموں کی آواز زمین کے ساتھ میرے دل کو بھی دہلا رہی تھی۔

"واہ ری، لونڈیا ــــ واہ، کالج میں کیا پڑھنے لگی ہے۔ بڑا دماغ ہی چڑھ گیا ہے۔ آئی اور کتابیں پھینک دیں۔ جیسے مفت ہی تو آئی ہیں، ٹھکانے سے الماری میں لگا کے رکھ۔"

اماں جی تو یہ نادر شاہی حکم صادر کر کے چل دیں، صفی کا منہ سوج گیا۔ جیسے برّوں نے کاٹ لیا ہو۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔

"خود کبھی پڑھا ہو تو جانیں بھی کہ کیا ہوتا ہے۔ ہم آپ تھکے تھکائے آئے۔ نہ چلئے نہ ناشتہ —— بس کتابیں سجاؤ۔ جیسے کوئی کتابوں کی دوکان ہے"!

"مگر صفی تم نے بھی تو اس بے دردی سے پھینکیں۔ جیسے واقعی مفت کی چیز ہو۔ اور پھر کتابیں!" میں نے ناول پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"بس چپ رہو تم —— بڑی آئیں نصیحتیں کرنے والی" صفی نے زور سے سر کو جھٹکا دیا۔ اور کھلے ہوئے بال اس کے سینے پر لہرانے لگے میں نے کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔ اور کنکھیوں سے دیکھنے لگی۔ صفی جھینپ گئی، اس نے بالوں کو آہستہ سے پیچھے کر دیا۔ اور میری طرف غصّہ سے دیکھنے لگی۔

"میرا کیا ہے، بھاڑ میں جھونکو —— کبھی جو علم آ لے" میں جل ہی تو گئی۔ ایک تو ان کے بھلے کی بات کہو اور اوپر سے صلواتیں سنو۔

"بس رہنے دو اپنی دقیانوسیت —— مجھے نہیں چاہیئے" صفی کا پارہ ایورسٹ کی چوٹی سے بھی بلند ہو گیا تھا۔ صورت سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اتنے میں سامنے سے ہماری نئی نویلی بھابی —— چلی

مستانہ وش بادِ صبا ــــ کی طرح آتی نظر آئیں۔ انھیں آتا دیکھ کر مجھے ڈھارس سی بندھی۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ چلو اس توتو میں میں سے جان چھوٹی۔

"ارے ــــ آ گئی کیا میری صفی۔ آج کہاں دیر لگا دی تھی"! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری امیدوں کو پھول کی طرح مسل ڈالا ہو۔

"زہرہ کے چلی گئی تھی بھابی ــــ کچھ نوٹس لینے تھے"!

"کیسے نوٹ؟ ادھار دیئے تھے کیا" مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی بھابی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"نوٹ نہیں، پڑھائی کے نوٹس ــــ کلاس کے"

بھابی نے ــــ "اچھا" ــــ کچھ اس انداز سے کہا جیسے سمجھ ہی تو گئیں۔ "میں کیا جانوں، کوئی اسکول کالج میں تھوڑا ہی پڑھی ہوں، اچھا اٹھ چل چائے پئیں، کتنی دیر سے تیرے انتظار میں رکھی ٹھنڈی ہو رہی ہے"! بھابی صفی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چل دیں، اور میں کمرے ہی میں پڑی سڑوں۔ مجھے چائے تھوڑا ہی پینا ہے۔ آج میں دیکھتی ہوں ان کو ــــ میں اٹھ کر پچھلے دروازہ سے خالدہ کے یہاں سرک گئی۔ اگر بدلا نہ لیا تو میرا نام بھی برجیس نہیں۔ جب دیکھو یہی ــــ آؤ ہم بھی تو

گھر ہیں رہتے ہیں۔ صفی ان کو جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتی اور یہ ہے کہ ہر دم اس کے دُم کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ جب تک وہ کالج سے نہیں آتی بیگم صاحب اپنے کمرے سے کیا مجال جو نکل آئیں اور جیسے ہی اس کی آواز سُنی دوڑی ہوئی آ گئیں، میری آنکھوں میں بھابی کی شکل پھر گئی۔ گلے میں دوپٹہ پڑا ہوا وہ بھی رسّی کی طرح اور اماں بی جیسے چیخ رہی ہوں

"بہو — اتنی مرتبہ کہہ دیا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا کرو بیاہیوں کی طرح"۔ "اوڑھے تو ہوں بوا اور کیسے — "

"یہ کیا ڈھنگ ہیں — دوپٹہ گلے میں پڑا ہے اور گیند اچھالتی پھر رہی ہو" بھابی کی نظریں جھک گئیں، انھوں نے آہستہ سے دوپٹہ کے الیبٹ کھولے اور سینے پر تان لیا۔

"برجیس آپا کتنی مرتبہ کہا کہ میرا جمپر کاٹ دو پر تم نے کاٹ کر نہیں دیا" خالدہ مجھے دیکھ کر دوڑی آئی۔ میرا غصہ دھیما پڑ گیا۔

"اچھا۔ لا کاٹ دوں، اچھا سا — بالکل نئے فیشن کا"

"ویسا ہی جیسا صفی آپا پہنے تھیں۔ جہاں جاؤ وہاں صفی آپا ہی کا ذکر۔ میں تو گھبرا گئی۔ یہ بھی کوئی بات ہے، دنیا جہان میں لے دے کر ایک صفی ہی تو رہ گئی ہے۔

"نہیں ویسا نہیں وہ تو بڑا گنوار و سلا ہے" اور پھر میں خاموشی سے

جمپر کاٹنے میں مشغول ہوگئی۔

"ایسا ہی تو آپا بھی کہہ رہی تھیں، یہی تو صفی آپا کے گلے کا ڈیزائن ہے۔"

"چھوڑو بھی ــــ تمہیں پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔"

میں اُٹھ کر چلی آئی جیسے سارا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ یہی تو بس میں چاہتی تھی۔ میں نے کمرے میں آکر اسٹوو جلایا۔ باورچی خانے سے کیتلی اور چائے کی پیالی لائی، میری نظر بھابی کے کمرے میں دریچے سے چھن کر صفی اور بھابی پر پڑی ــــــ کس قدر گھٹ رہی تھی جی میں تو آیا کہ ذرا سنوں کیا باتیں ہو رہی ہیں پر اتنی ہمت نہ ہوئی اور میں کمرے میں آکر چائے بنانے لگی، میں بھی کبھی جو بھابی کو پوچھوں یہاں تو بھابی بھابی کہتے منہ دکھتا ہے اور یہ ہیں کہ کبھی سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں ــــ صفی کی کیوں نہ خوشامد کریں گی۔ کالج میں جو پڑھتی ہے۔ اور بھابی سے تو ہر وقت کھسر پھسر، کالج کی ایک ایک بات ان کے آگے دہراتی ہے۔ میں تو اس کی کچھ ہوتی ہی نہیں جیسے بس لے دے کر بھابی ہی رہ گئی ہیں۔ آنے دو صفی کا امتحان ــــ وہ دماغ دار جو ایک دن بھی کبھی بات کر لے۔ میری نظریں اسٹوو کے لال نیلے شعلوں میں الجھ کر رہ گئیں، میں انجانے طور پر گنگنانے لگی۔ ع

چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

دیر تک یہ مصرع دماغ سے لے کر زبان تک مجھ پر حاوی رہا۔ جلے پی کر میں باورچی خانے میں بیٹھ گئی اور پیاز کاٹنے لگی۔ یونہی بے کام کا ایک کام نکال لیا۔ بھابی اور صفی کی آواز باورچی خانے میں صاف سنائی دے رہی تھی، اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بغیر جلے بوجھے۔

"ہاں تو کبھی تمھارے پروفیسر لڑکیوں کو بھی ڈانٹتے ہیں"

"لڑکیوں کو کیا ڈانٹتے، وہ تو لڑکوں کو بھی کچھ نہیں کہتے۔ اسی لئے تو ان کی کلاس میں لڑکے جی کھول کر شرارت کرتے ہیں"

"اچھا ــــ لڑکے شرارت کرتے ہیں"

"اوہ کیا ابھی بتایا نہیں۔ کل ہی کملا کی چوٹی کسی نے پیچھے سے بینچ سے باندھ دی اور جب وہ اٹھ کر چلی تو گھوڑے کی ڈور کی طرح تن گئی ــــ"

بھابی کی آواز کے ساتھ کمرے میں قہقہہ گونجا۔ بھابی اور صفی دیر تک ہنستی رہیں۔

"اچھا خیر۔ چھوڑو بھی یہ قصے مجھے انگریزی پڑھاؤ۔ میں بھی کالج میں داخلہ کراؤں گی"۔ اور نہ جانے کیوں بھابی کو پڑھنے کا شوق ہوا۔

"اجی ــــ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں، خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے"۔ جیسے بس یہی تو ایک پڑھنے والی ہیں۔

"آخر میں کیوں نہیں پڑھ سکتی، کیا میں آدمی نہیں"

"ارے بھائی ــــ بڑا دماغ کھپانا پڑتا ہے" اور بھابی خاموش ہو گئیں جیسے وہ شاخ ٹوٹ رہی ہو جس پر انھوں نے جھولا ڈالا تھا۔

ــــ کم عمری کی شادی ہائے اللہ ــــ میرا دل خود بخود بھابی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ پرسوں کی بات ہے جب بھابی نے پڑھائی کا بھائی جان سے ذکر کیا تو انہوں نے کیسا مذاق اُڑایا۔

"بڈھی گھوڑی لال لگام، ابھی کیا تھا۔ کل کو کہنا کہ کلب ٹینس کھیلنے جاؤں گی"۔ اتنا پڑھے لکھے بھیّا اور ایسی باتیں۔

"سترہ برس کی بڈّھی گھوڑی ہو گئی ــــ بھابی نے جواب دیا۔

"اور کیا بیٹی"۔ لڑکی تو شادی ہوئی کہ سِن سے اُتری۔ بارہ برس ہی کی کیوں نہ ہو۔ یہ گال بس چار دن کے ہیں۔ پھر جہاں پیٹ میں پڑا سب ختم"۔

بھابی کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ اور آنکھیں جیسے ان میں لال ڈورے سے پڑ گئے ــــ آخر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے بھائی جان بدن میں گویا کاٹو تو لہو نہیں سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا، اماں

یہ کہہ کر چل دیں اور بھابی جھپاک سے اپنے کمرے کی طرف جھپٹیں، بس مجھے ایسا معلوم ہوا کہ فضا میں آنچل لہرایا اور پھر غائب، میں بھی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں پہنچی ——— دیکھا تو الٹی پڑی رو رہی ہیں اور اس صفی کی بچی سے اتنا نہ ہوا کہ جا کر چپ کرا لیتی۔ الٹا منہ پچکا کر کہتی ہے اُوئی بھابی ——— یہ پڑھنا ور ڑھنا تمھارے بس کا روگ نہیں ——— بھابی" ——— اور بھابی اس کا منہ تاکنے لگیں جیسے صفی نے ان کو گالی دے دی ہو ——— لیکن یہ بلا وجہ رونا کیسا ———؟

پھر ———

"چاہے کچھ ہو جائے، میں تو تجھی سے پڑھ کر رہوں گی" میں نے جھانک کر دیکھا بھابی صفی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ "میری صفی پڑھائے گی کیسے نہیں"

"ہائے اللہ ——— چھوڑو بھی۔ سچ مچ بھابی تمہاری یہ کیا بُری عادت ہے۔ اس طرح بھینچتی ہو کہ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں" میری نظریں غریب صفی پر پڑیں جس کو بھابی کی گرفت اور زیادہ پکڑے ہوئے تھی۔ مجھے صفی کی صورت دیکھ کر ہنسی آ گئی، اور بھابی نے نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر صفی کو چھوڑ دیا۔ جیسے چوری پکڑی گئی ——— تب کہیں جا کر صفی کے جان میں جان آئی۔

"جاؤ ــــ بھائی جان سے پڑھو، وہ تو اچھا پڑھاتے ہیں، مجھے بھی تو انھوں نے ہی پڑھایا ہے"۔

"میں تو نہیں پڑھتی بھائی جان سے" بھابی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان سے ــــ" مجھے ہنسی آگئی "اے لو تمھارے بھی بھائی جان ہو گئے"

میں نے پھر جھانک کر دیکھا بھابی صفی سے بری طرح چمٹی ہوئی تھیں "دیکھو کتنی دفعہ منع کر دیا۔ نہ جانے تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ آخر کوئی حد بھی ہے، سارا جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے لگا ہے"

"اچھا میرا داخلہ بھائی جان سے کہہ کر کالج میں کرا دے، پھر کبھی جو تجھے کچھ کہوں" بھابی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔

"میرا کیل ہے، میں کہہ دوں گی۔ مگر اپنی برجی آپا کو منالو"

"اپنی برجی کو منالو" مجھے دھکا سا لگا۔ جیسے میں ہی تو ان کے ہر کام میں روڑا اٹکاتی ہوں۔

پھر ــــ

چند روز بعد میں نے دیکھا کہ بھابی کی پڑھائی سارے گھر کا ایک اہم موضوع بن گئی۔ دن بھر اس پر جھگڑا ہوتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر بھائی جان

پر غصہ آتا۔ آخر ان کا کیا جاتا ہے، وہ پڑھنے جاتی ہیں تو جانے دو۔ آخر صفی بھی تو جاتی ہے۔ اگر غریب بھابی چلی گئی تو کیا گناہ ہو گیا۔ اور کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ وہی بھائی جان جو کل تک ایک تعلیم یافتہ بیوی کے آرزومند تھے آج اپنی بیوی کی تعلیم سے گھبرا رہے تھے۔

"آخر تجھے کیا پڑی ہے۔ لکھ پڑھ کر کیا نوکری کرے گی"۔

"تو صفی کو نوکری کے لئے پڑھا رہے ہو کیا"؟

"صفی ـــ اس کی اور بات ہے۔ اس کا اور تیرا مقابلہ"۔

"بس بھابی میرا نام مت لینا۔ اپنا قصہ آپ طے کرو۔ مجھے بیچ میں کیوں سانتی ہو"

اور بھابی نے صفی کو گھور کر دیکھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے مسل ڈالیں گی۔ اور کرد چھپ چھپ کر صفی سے باتیں۔ اور لگا دُ کلیجے سے ارے میں تو اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بھابی کی تیز نظروں کے جواب میں صفی نے آخر بھائی جان سے کہہ ہی دیا۔

"ایسے ہی ان کو پڑھنا ہے تو آپ سے کیوں نہیں پڑھتیں۔ کیا فائدہ روپیہ خراب کرنے سے" میں بھابی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی وہ چپ چاپ زمین پر نظریں گڑ دئے ہوئے آکر بیٹھ گئیں۔ ان کی پُر آب آنکھیں گویا خود ہی آنسوؤں کے بوجھ سے گھبرا رہی تھیں جو پلکوں سے

سہارے رکے ہوئے تھے۔ اور گرنے سے پہلے کسی خاص سوچ میں ڈوبے ہوئے
تھے۔ انہوں نے کئی بار آہستہ آہستہ پلکیں جھپکائیں۔ جیسے اس طرح وہ ان
آنکھوں میں جذب ابھی تو ہو جائیں گے، ٹیگور۔ اقبال کی تصویریں گویا
بھابی کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ اور کمرے کی تمام کتابیں گویا بھابی کو زور
زور سے پکار رہی تھیں۔ بھابی کی نظریں تصویر پر پڑیں اور جھک گئیں
وہ آنسو جو کسی اشارے کے منتظر تھے برسات کی بوندوں کی طرح ٹپ
ٹپ گرنے لگے۔ بھابی کے آنے کی خوشی کے باوجود افسردگی کی ایک لہر
سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے جھرجھری سی محسوس ہو لی —
میں اور بھابی — "تارے ٹمٹمارہے تھے"۔ خاموشی سے اس طرح باتیں
کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہوں۔ ان
بہن بھائیوں کی طرح جو آپس میں لڑکر ایک دوسرے کو گھورتے ہیں
جیسے ماضی کے افسانے آنکھوں ہی آنکھوں میں دہرا رہے ہوں۔ ایک
طویل خاموشی کے باوجود بھی ایک دوسرے سے کتنا قریب۔ زبان سے
بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس شاخ کی طرح جو پھول کے ٹوٹ
جانے کے باوجود اپنی آغوش وا کئے رہتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنا نزدیک ہو
گئے جیسے وہ دو ستارے — وہ دو بہن بھائی۔

اب بھابی ہر روز شام کو مجھ سے پڑھا کرتی تھیں. اور بھائی جان سے تو وہ بہت ہی گھبراتی تھیں ۔ کتنا اچھا پڑھاتے ہیں بھائی جان۔ سارا گھران کے پڑھانے کی تعریف کرتا ہے. اور بھابی — ان کے امتحان میں تو وہ فیل ہو گئے۔ان کو دور سے آتا دیکھ کر وہ تکیئے میں کتاب دبکا لیتیں۔ ماضی کے دھندلکے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کہیں کہیں دھیمی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔گویا قبرستان میں چراغ جل رہا ہے۔ اور اس گھٹا ٹوپ اندھیارے میں. جیسے قبرستان کے کھنڈروں سے میں ہانپتی کانپتی چلی آ رہی تھی۔ تیز تیز قدم جماتی ہوئی ۔ کبھی ٹھٹھکتی اور پیچھے مڑتی پھر آگے بڑھ جاتی — آکاش پر کبھی تو تارے ٹمٹماتے اور کبھی بالکل ہی گُل ہو جاتے جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دیئے ہوں۔

"یہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہے"؟

"طلسم ہوش ربا تھوڑا ہی ہے" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بال پکڑ کر گھسیٹ لئے ہوں ۔ کمبخت یہ کتابیں پڑھتی ہے۔بچپن یہ سب چھلیتے گذر گیا اور اب — بھابی کی کتاب تکیئے میں دبی ہوئی تھی۔

"تمھاری کتاب نہ ہوئی۔ طلسم ہوشربا ہو گئی"۔

" بھابی مسکرائیں اور پھر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے صفی آگئی۔ بھابی پوری طاقت سے اس کو بھینچ رہی تھیں۔ اس کا ــ سانس پھول رہا تھا ــ " اوئی اللہ، چھوڑو بھی کیا بری عادت ہے جو اس طرح بھینچتی ہو۔ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں" میرے بھی جی میں آئی کہ اسی طرح، جنوں بھر جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اور میری آنکھیں ایک لذّت آمیز کرب سے اچانک پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صفی بے وقوف ہے جو اس زور سے چیختی ہے۔ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا میں جھینپ سی گئی ــ بھابی کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی اور اُن کا سانس ــ جیسے بہت دور سے دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہوں ــ بے نیل و مرام۔

" میں نا پڑھتی ــ یہ انگریزی ونگریزی ــ مجھے تو کہانیوں والا کوئی مزے دار رسالہ دے" ــ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر کسی رسالہ کا ایک پرچہ ــ نہ جانے کب کا پرانا۔ الماری سے نکال کر یہ جا وہ جا۔ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بھابی ایسی غائب ہوئیں کہ گھنٹوں کے لئے لاپتہ ــ

" تو اب یہ رسالہ پڑھا جا رہا ہے" میں چونک ہی تو پڑی۔ بھابی کے کمرے سے صفی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ تمھارے لئے ہی تو

اختر الایمان نے کہا ہے ؎

یونہی اک دور آتا ہے یونہی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں

بس اس کی تنقید سے تو خدا بچائے۔ جس کے پیچھے پڑتی ہے ہاتھ دھو کر پڑتی ہے۔ ادھر بھابی اور مصیبت، میں سچ مچ ان کو سمجھنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ اب جو رسالوں کا دورہ شروع ہوا تو بس صبح سے شام تک یہی مشغلہ۔

رات میں بھابی کے کمرے میں دندناتی پہنچ گئی۔ یہ بھی تو نہیں دیکھا کہ کمرے میں کوئی ہے بھی کہ نہیں۔ بھلا دس بجے ان کے کمرے میں ایسے بے دھڑک پہنچ جانا۔ امی دیکھ لیتیں تو آفت ہی تو کر دیتیں۔

"بہو کو آرام کرنے بھی تو نہیں دیتیں یہ لونڈیئیں۔ جب دیکھو گھسی رہتی ہیں اس کے کمرے میں" بڑا ان کے آرام کا ہی تو خیال ہے۔ ویسے تو جب دیکھو ایک نہ ایک جھگڑا کھڑا رکھتی ہیں۔ ذرا موقع ملا اور لڑیں۔ مگر ہم ان کے کمرے میں جائیں تو آفت ——— جی میں تو آتا ہے کہ بالکل ہی ان کے کمرے کا بائیکاٹ کر دوں۔ کیا ان کے کمرے میں جائے بغیر ہمارا کوئی کام رکا پڑا رہ جاتا ہے۔ مگر اس میں بھابی کا کیا قصور۔ وہ بیچاری تو کس خوشامد سے کہتی ہیں :-

"آیا کرو برجی، میرے کمرے میں جب جی چاہے ـــ کس کا ڈنڈ پڑا ہے تمھیں"ـــ اور میرے قدم آپ ہی آپ کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ بھائی جان اپنی الماری کے قریب کھڑے نہ جانے کیا کر رہے تھے، مگر مجھے کیا میں تو بھابی کے پاس گئی تھی۔ اور بھابی کہہ رہی تھیں۔

"آخر میں کیا کروں میں بھی تو مجبور ہوں۔ ایسی کہانیاں پڑھنے سے ہونا کیا ہے ـــ کوئی ان کے پڑھنے سے ـــ"

مجھے آتا دیکھ کر بھائی جان نہ جانے کیوں گھبرا سے گئے۔ انھوں نے پٹ سے الماری بند کر دی اور ایسے چپ ہوئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر بھابی بولیں۔

"آخر اس کے پڑھنے میں کیا عیب ہے ؟"

"عیب کیسے نہیں" وہ پھر بولے۔ "یہ رسالے تم کو نہیں پڑھنے چاہئیں"۔

"واہ ـــ اگر عیب ہے تو پہلے اپنی بہن کو منع کرو۔ بعد میں مجھے کہنا"

"برجی کی اور بات ہے"۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چلتے چلتے کسی پتھر سے ٹکرا گئی۔ یہ آخر کیا ہے صفی کی اور بات ہے، برجی کی اور بات ہے۔ یہ بھابی نے شادی کر کے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو ان کی اور بات نہیں۔

اور مجھے بھابی کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل معلوم ہوئے۔ جن میں نہ جانے کتنے ان دیکھے سپنے الجھ الجھ کر ٹوٹ رہے تھے۔ بھلا یہ خواب کہیں

حقیقتوں کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں۔ بھائی جان کمرے سے باہر نکل گئے اور
بھابی مسہری سے اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

روشنی میں صفی کا رسالہ سامنے پڑا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دروازے کی
چوکھٹ پر کھڑی کہہ رہی تھی:" اوئی اللہ — چھوڑو بھی — کیا بری
عادت ہے جو اس طرح.. بھینچتی ہو کہ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں۔

اچانک بجلی بجھ گئی — سایہ غائب ہو گیا اور ہم دونوں اندھیارے
میں سورج کو تلاش کر رہے تھے ——

میرے گالوں پر آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ میں نے اپنی آنکھیں
بھینچ لیں۔ دوسرے کمرے میں صفی کے گنگنانے کی آواز ہلکے ہلکے سنائی دی۔

لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

مگر سچ تو یہ ہے کہ رات باقی ہے۔ سویرا بہت دور ہے۔ آنسوؤں
کی منزل کے بعد کہیں تاروں کی محفل جگمگائے گی۔

"زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی"

کتنی دیر ہو گئی، گاڑی آنے کا نام نہیں لیتی ـــ یہ جبل پور ہے۔ میرے ذہن میں بار بار "یہ جبل پور ہے" گھوم رہا تھا۔ گویا آل انڈیا ریڈیو سے اعلان ہو رہا ہے ـ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آسمان زمین سب ناچ رہے ہیں میں خاموش تمام چیزوں سے الجھ رہی تھی، کاش میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو روک سکتی۔

"آپا" جاوید نے آہستہ سے کہا۔

"چپ، بڑا آیا آپا آپا" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "یہاں بھی تو چین نہیں لینے دیتا، تجھ سے یہ بھی تو نہ ہوا کہ اسپرو کا ایک پیکٹ ہی لے کر چلتا اب یہ زمین کیسے رُکے گی؟"

"کیسی زمین ـــ" اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے زینن نہیں، سر کا درد "۔

وہ خاموش ہوگیا ۔ اس کی شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بحث کرنے کے لیے تلا ہوا ہے، مگر نہ جانے کیوں خاموش ہوگیا۔ شاید اس لئے کہ کہیں میرے غصے کے لپیٹ میں نہ آجائے۔ جو خواہ مخواہ کی مار پڑے۔ ادھر امی بھی تو نہیں ہیں جو اسے بچائیں گی۔

"آپا مجھے کیلے دو" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" نہیں، کیلے نہیں کھاتے نفخ ہوتا ہے۔" اور جاوید پھر ہار گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے دوڑتے دوڑتے پکڑا گیا ہو۔ اور زمین پھر ناچنے لگی۔ آسمان گھومنے لگا ___ ہر طرف کالا کلوٹا دھواں ___ میرے سامنے ہر چیز حرکت کر رہی تھی۔

" اوں ___ جاوید ___ چلو وھیلرز کی طرف چلیں۔

" کیلے لوگی"

"کمبخت کتابوں کی دکان پر ___ تیرے دماغ میں تو کیل گھوم رہے ہیں۔ کتابوں کی دکان کیوں آنے لگی۔ دن بھر گھومتا پھرتا ہے، پڑھنے لکھنے سے تو مطلب نہیں۔ تو پھر کتابوں کی دکان کیا خاک دماغ میں آئے گی۔ گھر چل امی سے جھتوایا نہ ہو تو میرا نام نہیں " ___ جاوید چپ ہوگیا۔ مجھ کو اس کی خاموشی پر غصہ آیا۔ جی چاہتا تھا کہ مجھ سے بحث کرے۔

کوئی میں بے وقوف ہوں" اور وہ تو ایسا چپ ہو گیا کہ جیسے کوئی کتا ہو جو بھونک رہا ہو۔ میں غصہ میں آگے آگے چلنے لگی ۔ جاوید پیچھے گھسٹ رہا تھا۔ "چلا بھی تو نہیں جاتا۔ کوئی تیرے لئے موٹر لائے گی"

"مگر آپا کتابوں کی دکان تو یہی ہے"

"پہلے کیوں نہیں بتایا" اور میں بڑھتی ہوئی دکان تک پہنچ گئی۔ — میری نظریں اس نیم عریاں تصویر پر پڑیں جو کسی انگریزنہ خاتون کی تھی۔ "سچی کہانیاں" میں چونک پڑی۔ آخر یہ "سچی کہانیاں" نام رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کہانیاں کبھی جھوٹی بھی ہوتی ہیں۔ بیوقوف کہیں کے۔ جی میں آیا کہ ان رنگ برنگے رسالوں کو پھینک دوں۔

"بیگم صاحب ۔ یہ شمع لیجئے۔ مست قلندر۔ لطفِ شباب" مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ بدتمیز کہیں کے۔ بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔ میں دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

"بیگم صاحب آپ نہیں جانتیں۔ یہ اردو کے بڑے اچھے رسالے ہیں" اور اس نے اپنی نگاہوں سے میرے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ گویا یہ شلوار اور دوپٹہ پہنے دبلی پتلی لڑکی ضرور ہندوستانی مسلمان ہوگی، کیا خوب معیار ہے۔

"ادبی دنیا، سویرا، ادبِ لطیف، افکار ہیں آپ کے پاس؟"

اور اس نے اپنے رسالوں کو سمیٹتے ہوئے میری طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اگر میں اچھے کپڑے نہ پہنے ہوتی تو ضرور کہتا:

"تم سمجھتے ہیں تمھیں خریدنا وریدنا ہے نہیں، بے کار وقت خراب کرتی ہو۔ یہ رسالے بھی کوئی پڑھنے کے ہیں" اور وہ دوسرے خریدار کی طرف مخاطب ہوا —— مجھ کو پہلی بار محسوس ہوا کہ جیسے میرا سر چکرا رہا ہے زمین اور آسمان اپنی جگہ پر رکے ہوئے ہیں —— میری آنکھیں اور میرا ماتھا۔ اُف بخار —— کاش کوئی دریا ہوتا اور میں کود پڑتی —— سامنے سے اخبار والا ناچتا ہوا، گھومتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ کہیں میرا سر تو نہیں چکرا رہا ہے، مگر ہاں میرا سر بھی چکرا رہا تھا اور اخبار والا بھی —— اور اس کے اخباروں کا بنڈل بھی ——

"کلکتہ میں قتل و خون —— ہندو مسلم دنگا —— دو آنے —— دو آنے ——"

"کتنا سستا ہو گیا ہے یہ دنگا بھی ——"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سینے پر ایک تیر کھینچ مارا —— کیا نئے ہندوستان کی آزادی کا راستہ یہی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ انقلاب خونی ہوتا ہی ہے۔ فرانس اور روس کا انقلاب اور تھا یہ ہندوستان کا انقلاب ہے۔ اور میں نے محسوس کیا گویا مجھے سکون

ہوگیا، مگر کلکتہ کا یہ طوفان ــــ کس طرف جائے گا۔
میں نے دو آنے پھینک کر اخبار لے لیا۔ جلدی جلدی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ خدا جانے میری نظریں اس اخبار میں کیا تلاش کر رہی تھیں میں نے پہلا صفحہ الٹ دیا۔ ہوں "گاندھی جی کا خیال ہے کہ کلکتہ اشانتی نگر ہے۔" کتنے جھگڑے ہو چکے۔ آزاد ہند ــــ جہازیوں کی بغاوت ــــ ڈاکیوں کی ہڑتال، اور اب ایک اور تشدد ــــ اب تو اس کو خدا ہی بچا سکتا ہے۔
ٹھیک کہتے ہو مہاتما جی ــــ انگلستان کے بادشاہ کے محل پر بم کے دھماکے کی آواز کے تصور سے جب تمہارے آنسو بہہ نکلتے ہیں تو پھر یہ تو غریب انگریزی حکومت کے نمائندے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کیوں نہ کلکتہ والوں پر غصہ آئے گا۔ میں نے اخبار مروڑ کر تھیلے میں ڈال لیا۔

"آپا، دو آنے میں تین کیلے ملتے ہیں" میں چونک پڑی جیسے میں اڑی جا رہی تھی اور اچانک گر پڑی۔ میرا سر چکرانے لگا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی ــــ گھڑ گھڑ ــــ گویا ہم سب بھاگ رہے ہیں زمین بھاگ رہی ہے۔ ہر طرف سے آوازیں آ رہی ہیں ــــ بھاگو بھاگو ــــ اس لئے کہ شانتی نکیتن ــــ اشانتی نگر ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان آزاد ہو رہا ہے ــــ ایک نیا ہندوستان جنم لے رہا

ہے ـــ قتل اور خون کے بیچ میں ـــ وہ انقلاب زندہ ہو رہا ہے
جس کے نعرے لگاتے لگاتے ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کے گلے
پھٹ گئے ہیں۔ "ہٹو ـــ بچو"

اور ذرا سی دیر میں گاڑی وندناتی ہوئی دھرتی ماتا کے سینے
پر چڑھتی چلی گئی۔ اور میری نظروں کے سامنے وہ پٹریاں پھیل گئیں جو
ایک دوسرے سے الگ پڑی رہتی ہیں ـــ اور اس طرح گاڑی ان
کے سینے پر چڑھتی ہوئی نکل جاتی ہے ـــ اب یہ پٹریاں کبھی نہ اٹھ
سکیں گی۔ بے حس کہیں کی ـــ مجھے پٹریوں پر غصہ آنے لگا۔ یہ آخر
اس کو کیوں سہارا دیتی ہیں ـــ

"دھڑ ـــ دھڑ ـــ اڑادھم ـــ"

ایسا معلوم ہوا جیسے کائنات ہل گئی، زمین لرز گئی ـــ جیسے اس
گائے نے سینگ بدلا جو اپنے ایک سینگ پر دنیا کو لئے کھڑی تھی۔
اور اب تھک کر اس کو دوسرے سینگ پر ٹکا رہی تھی ـــ

اُف کتنا بڑا حادثہ ـــ میں چونک پڑی۔

انجن پٹری سے اُتر گیا تھا ـــ کتنی جانیں ـــ اُف میرے اللہ
ـــ اب کیا ہوگا ـــ یہ پٹریاں ـــ شاباش ـــ کون کہتا ہے کہ بے
حس ہو ـــ دکھا نا ـــ ایک ذرا سی جنبش میں پوری ریل کو راجہ کے

محل کی طرح اڑا اڑا دھم کر دیا ـــ اچھا ہے یہ محل کسی طرح گریں بھی۔
میں دوڑ کر موقع پر پہنچ گئی۔ پلیٹ فارم پر لوگ گھبرائے ہوئے
ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے ـــ میری نظر ایک کھڑکی پر پڑی
ایک مسافر پیچھے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، لال لال وردیاں پہنے ہوئے
قلی اس کی طرف دوڑے۔ اور اس کو نکالنے میں مصروف ہو گئے۔
"کمبخت ہندو ہے یا مسلمان ـــ پہلے یہ تو پوچھ لو"
"ہندو ہے یا مسلمان؟ ـــ واہ بیگم صاحب، ایک آدمی مر رہا ہے
اور آپ دھرم پوچھتی ہیں"
میں خاموشی سے ایک طرف نکل گئی ـــ ویٹنگ روم کے سامنے
کی بنچ پر "صرف عورتوں کے لئے" ـــ میں نے اس طرف گھور کر دیکھا
اس بنچ پر ایک نوجوان اس طرح بیٹھا تھا کہ انگریزی کی تحریر چھپ
گئی تھی۔ اس نے میری طرف بغور دیکھا، مجھے پھر اور بھی غصّہ آیا۔
کتنا احمق ہے۔ یہ بھی تو نہیں سمجھتا کہ اتنی دیر سے میرا مطلب کیا ہے۔
"کمبخت تو اندھا ہے، تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ یہ بنچ عورتوں
کے لئے ہے۔ گاڑی گر گئی ہے۔ لوگ امداد کو جا رہے ہیں اور تو دبک کر
یہاں بیٹھا ہے" مگر مجھ سے کچھ بھی تو نہ کہا گیا۔
اور نوجوان بغیر کچھ کہے اُٹھ گیا ـــ اور ویٹنگ روم کی طرف بڑھا۔

"نسرین اب کیا ہوگا! — حادثہ ہوگیا کیسے جائیں گے"

"حادثہ — ہاں اب کیا ہوگا کمل — کہیں ابا جان نہ آجائیں"

ان دو جملوں نے جیسے میرے سامنے پوری کہانی دہرادی۔ ہندو اور مسلمان — نئے ہندوستان میں ناممکن — کبھی نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس لڑکی پر غصہ آرہا تھا جو پڑھی لکھی ہو کر بھی ان قوانین کو نہ جانتی تھی — کلکتہ میں قتل و خون ہو رہا تھا۔ تب بھی بچہ کو نہیں معلوم کہ مذاہب نے انسان اور انسان کے بیچ میں کتنی بڑی دیوار حائل کردی ہے۔

"ہندو ہے یا مسلمان؟ — واہ بیگم صاحب، ایک آدمی مر رہا ہے اور آپ دھرم پوچھتی ہیں —"

میں چونک پڑی — وہ لال کپڑے والا قلی جیسے مجھ سے بازپرس کر رہا تھا۔ خدا جانے کس مذہب کا ہوگا — اور نہ جانے کس قسم کے خدا کی پرستش کرتا ہوگا — پلیٹ فارم پر، انھیں لال لال رنگ کے قلیوں کی دو رویہ قطاریں نظر آرہی تھیں۔ اور میں ہر ایک کی طرف باری باری سے دیکھ رہی تھی۔ گویا ان سے مذہب کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی، مگر ان کا مذہب نہ جانے کتنے دن کے فاقوں تلے دبا تھا۔

اور وہ دونوں ہندو اور مسلمان — نسرین اور کمل — دونوں پھول ہی تھے۔ مگر الگ الگ باغوں کے۔ دونوں ایک دوسرے سے جیسے

کوئی کہانی کہہ رہے تھے۔
نسرین کتنے دن سے تم میری آنکھوں کی پتلی بن کر رہیں۔ کتنے دن میں نے تم کو خیال و خواب کی بستی میں جھولے جھلائے ــــ کس طرح میں دریا کی لہروں میں تمہارا عکس دیکھتا تھا۔ چاند کی طرح تم کتنے دن سیہ راتوں میں جگمگاتی رہیں۔ اور میں آسمان کے اس تارے کی طرح تم کو دور ہی سے دیکھتا رہا۔ اور جب تم سے قریب پہنچا تو تم زمین کی گردش کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ یہ زمین کی گردش ہی تو تھی جس نے اس گاڑی کو گرا دیا۔ جو ہم کو اس وقت نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتی ــــ اور پھر ہم اور تم زندگی کے ان خوابوں کو حقیقتوں کے رنگ و روپ میں ڈھالتے ــــ چاند اور تارے ایک دوسرے کے قریب ہو چکے ہوتے۔ "چاند اور تارے" بے وقوف کہیں یہ بھی ایک ہوتے ہیں۔ اور میں بنچ پر بیٹھی ان کو گھور رہی تھی۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ آیا اور پلکوں کا سہارا لے کر جم گیا نسرین اس قطرہ کو اس طرح روکے ہوئے تھی جیسے وہ چاند کے پاس والا تارا ہی تو ہے۔ جو اب اس سے جدا نہ ہو گا ــــ مگر وہ قطرہ اس سے سنبھل نہ سکا ــــ اور بکھر گیا۔
میری نظریں جھک گئیں ــــ تارے کو بکھرتے دیکھ کر میرے سینے میں دھکا سا لگا۔ کاش یہ آنسو کسی طرح رک سکتا ــــ کمبخت لڑکی بڑا سے

اتنا بھی نہ ہوا کہ اس کو روک ہی سکتی ۔ تو کتنی نادان ہے تو نے کبھی پھول کی پنکھڑی کو نہیں دیکھا۔ جو شبنم کے قطروں کو نہ جانے کب تک اپنی آغوش میں سمیٹے رہتی ہے — اور شبنم کے قطرے — آفتاب کی کرنیں ہی ان کو چاٹ سکتی ہیں — اور پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیاں شبنم کی ان بوندوں کو تازگی بھی نذر کر دیتی ہیں ۔

"نسرین! — اب کیا ہوگا"

"کمل! ابا جان آتے ہی ہوں گے"

میں بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جاوید کی انگلی پکڑ کر کسٹرین کی طرف بڑھی۔ "یہاں بیٹھنے سے کیا فائدہ ؟"

کسٹرین کے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ سب انسپکٹر کو آتے دیکھ کر میں چونک پڑی ۔ میرا رنگ فق ہوگیا — سب انسپکٹر نے مجھے غور سے دیکھا۔

"یہ نہیں — انسپکٹر صاحب — وہ سامنے ہے آیئے"

"معاف کیجئے گا وہ کمینہ ہندو ہے — میری لڑکی کی عمر ۱۲ سال کی ہے ۔ یہ اغوا ہے اغوا —"

وہ کہتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا —

اور میری نظروں کے سامنے کلکتہ کا خونی منظر پھر گیا — نسرین اور

کمل — اور وہ لال لال قلی — ہندو ہے یا مسلمان — واہ بیگم صاحب — ایک آدمی مر رہا ہے اور آپ دھرم پوچھتی ہیں۔

میرا سر درد سے گھومنے لگا — گویا دھرتی کے نیچے چھپی ہوئی گائے نے پھر سینگ بدلا اور دھرتی چکی کے پاٹ کی طرح گھومنے لگی ہر طرف سے وحشتناک آوازیں — کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے — کون کہتا ہے اس زمین پر بے حس چیزیں بھی ہیں۔ میری آنکھیں تو سب کو بھاگتے دوڑتے دیکھ رہی ہیں — اور وہ کتابوں کی دکان پر لٹکی ہوئی نیم عریاں تصویر بھی تو ناچ رہی تھی۔ کیسا وحشتناک ناچ —

"سچی کہانیاں" میرے دماغ میں پھر گونجا اور ساتھ ہی میں نے قہقہہ لگایا — بے وقوف کہیں کے۔ کہانیاں بھی کبھی جھوٹی ہوتی ہیں —

گوتم کی سرزمین

سورج ڈوبے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ یوں تو چاندنی رات تھی مگر بادلوں کی وجہ سے چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی اور اس بڑھتی ہوئی سیاہی کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہ تھی ـــــ پھر سیاہی اور اندھیرا تو ایک بات، یہ سنّاٹا تو اس کی روح کو اور کھائے جا رہا تھا۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ یوں تو اس کا گھر شہر کے بیچوں بیچ میں تھا اور پہلے وہ اس ہماہمی سے اتنا گھبرا چکی تھی کہ اس کی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح یہ گھر یہاں سے اُٹھ کر شہر سے باہر جا پہنچے ـــــ آبادی سے دور پہنچ جائے جہاں ہر طرف خاموشی ہو ـــــ مگر آج تو یہی خاموشی، یہی سنّاٹا اس کے کچوکے لگا رہا تھا۔ اور جب دیر تک اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے اپنے چھوٹے سے بچّے ہی کے تھپّڑ لگایا اور وہ اک دم چیخ اٹھا مگر پھر فوراً سہم گیا

اور دوبارہ وہی خاموشی اور وہی جان لیوا سناٹا ۔۔۔ اس نے نا امید ہو کر
درختوں کی طرف دیکھا پتے ہی کھڑکیں تو کچھ اطمینان ہو، مگر اسے ایسا
محسوس ہوا جیسے وہ بھی سہمے ہوئے کھڑے ہیں اور وہ دروازہ کی طرف
بڑھی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر سڑک پر نظر دوڑائی مگر وہ سڑک ۔۔۔
جس پر چاند کی دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی تھی اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے
کسی نے چاقو سے اس کو ذبح کر ڈالا ہو۔ اور وہ بھی یوں ہی بے جان
لاش کی طرح پڑی تھی۔ جس کا خون منجمد ہو گیا تھا۔ اور وہ مردہ لاش یوں
ہی پڑی رہی اچانک ایک آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اور اس نے دیکھا
کہ ایک جیپ کار اس لاش پر سے گذر گئی۔ لاش بے حس پڑی رہی فضا
میں دھول اڑ رہی تھی اور اس کے دیکھتے دیکھتے وہ دھول پھر لاش پر بیٹھ
گئی۔ اس کا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ نہ جانے یہ موٹر اس
طرح کیوں گذر گئی۔ خیالات اس کے دماغ میں اُمڈتے مگر پھر فوراً ہی
اس نے دروازہ بند کر دیا۔ دھڑ سے ایک آواز آئی مگر چھوٹا بچہ اپنی ماں
کی اس حرکت کو بالکل ہی نہ سمجھ سکا۔ وہ اسے برابر گھورتا رہا۔ نہ جانے کیوں
پھر اس کو یہ خیال آیا کہ یہ جگہ اس کے پیروں سے کتنی روندی گئی ہے۔
اس نے زندگی کی کتنی شامیں اس کی نذر کیں۔ اس نے کتنا وقت یہیں
کھڑے کھڑے گذارا جب اس متحرک جسم کا وجود بھی اس کے جسم میں نہ

تھا۔ جب زندگی میں سناٹا تو کیا؟ طوفان بھی تھا، اس نے دروازہ کھولا مگراندھیرے میں اس کو کچھ بھی تو پتہ نہ چلا نہ جانے وہ زمین پر کیا دیکھنا چاہتی تھی اور پھر اچانک وہ گھبرا گئی جیسے فضا میں کوئی آواز لہرائی —— نرم اور رسیلی آواز —— "انجم"

وہ اس آواز کو دوبارہ سننا چاہتی تھی وہ آواز جو فضا میں گونج رہی تھی "انجم" —— دروازہ تو کھلا ہوا تھا کہیں امی نے تو نہیں بلایا نماز پڑھ چکی ہوں گی، ناراض ہوں گی —— اور پھر اس کے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔

"گھر کی چارپائی پر تو کیلیں جڑی ہیں کیلیں"۔

اس نے امی کو کبھی یہ بھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ کسی کا انتظار کرتی ہے نہ جانے اتنی سی بات اگر امی کو معلوم بھی ہو جاتی تو وہ کیا کر لیتیں۔ شاید وہ اور خوش ہو ہی جاتیں۔ مگر اس نے ہمیشہ اس راز کو اپنے سینے کے دریچوں میں بند رکھا۔

"ہوں —— آئی امی ننھے کو بہلا رہی تھی ——" اس نے آہستہ سے ننھے کے تھپکی لگائی۔ مگر آج اس نے طے کر لیا تھا کہ ہرگز نہ روئے گا خواہ وہ کچھ کر ڈالے۔

اس کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے یوں تو وہ نسیم کو عرصہ

سے جانتی تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کی عبادت کرتی تھی۔ مگر جب وہ اس گھر میں آئی تو نسیم اس کا اپنا ہو چکا تھا لیکن یہ احساس پھر بھی اس کے دل میں اندر ہی اندر چٹکی لیتا تھا کہ جیسے وہ اب بھی کسی اور کا ہے۔ وہ دروازے کی اوٹ میں اس طرح کھڑی رہتی کہ پہلی نظر اس کی ہی پڑے ـــــ اب تو خیر ننھے کا بہانہ تھا اور امی بھی یہی سمجھتی تھیں ـــــ مگر وہ تو شادی کے بعد ہی سے پاگلوں کی طرح اس کا انتظار کرتی۔ جب بازار کا شور رات کو سوتے تک رہتا تھا۔ وہ اس کا یوں ہی انتظار کرتی رہتی تھی۔ انتظار تو امی بھی کرتیں۔ مگر اس میں فرق یہی تھا کہ وہ بار بار ان کا ذکر کرتیں اور طرح طرح کے جملے اس کے دماغ میں گونجتے ـــــ جب فضا میں سناٹے کی حکومت تھی ان کا بیشتر وقت جائے نماز پر گذرتا۔ وہ ذات باری کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں مانگتیں:

"میرا بیٹا ساتھ خیریت کے گھر لوٹے"۔

اور انجم جھنجھلا سی جاتی۔ جیسے ساری دنیا میں بس ان کا ہی تو بیٹا ہے۔ جیسے بس یہی تو انتظار کر سکتی ہیں اور اسے انتظار کرنا ہی نہیں آتا ـــــ

"جا بیٹی کھانا کھا لے"۔

اس کا کتنا جی چاہا کہ آج امی سو جائیں مگر وہ کہاں سونے والی تھیں

وہ اگر سو جائیں تو ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دن کھا لیتی وہ بھوکی نہ تھی اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے محض ایک دن ساتھ کھانا کھانے میں اس کی روحانی بھوک ختم ہو جائے گی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ امی سو جائیں۔

"امی تم سو جاؤ میں انھیں کھانا کھلا دوں گی"

مگر توبہ کرو۔ امی سونے والی نہ تھیں وہ تو چارپائی پر اس وقت تک قدم نہ رکھیں جب تک نسیم اپنے بستر پر خراٹے نہ لینے لگے۔

اور اس طرح زندگی شور کے دنوں سے سناٹے کی راتوں میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ سناٹا کب تک رہے گا وہ اس نئی زندگی سے گھبرا چکی تھی اس کی نظر دوبارہ مردہ لاش پر پڑی جس پر کوئی چھری کا وار کر کے چل دیا تھا اور وہ لاش جس کا خون منجمد ہو گیا تھا جس کے ماتھے پر گرد اٹی ہوئی تھی ـــ چند دنوں سے عجیب حال ہے۔ اس کے سامنے ماضی اور حال بالکل اس لاش کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ "غلامی ـــ اور ـــ آزادی ـــ شور، طوفان اور آندھی ـــ پھر ـــ خاموشی، موت اور سناٹا ـــ"

وہ ماضی جب زندگی میں شور و شر تھا۔ جب غلامی تھی جب نسیم جلسوں اور جلوسوں میں پھرتا تھا۔ جب ہندوستان کی آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا اس کے کھدر کے کپڑے وہ لباس

جو آزادی کی تحریک کا دوسرا نام بن چکا تھا۔ جو اس کا نشان سمجھا جاتا
تھا اور اس لباس میں اس نے اپنے حسین جسم کو چھپا رکھا تھا۔ انجم
سیاست کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھ سکتی تھی اور
اس کو فخر تھا کہ وہ نسیم کی بیوی ہے۔ اس کو یاد ہے کہ پچھلے سال جب
کسی والنٹیر لڑکی نے اس سے پوچھا

"کیا آپ دیش سیوا کے لئے کچھ نہیں کر سکتیں؟"

"کیوں نہیں"؟ اس نے اپنا سینہ تان کر کہا

"مگر اس طرح گھر میں خاموشی سے پڑے رہ کر تو آپ کچھ نہیں کر سکتیں
اس کے لئے آپ کو باہر نکلنا ہوگا۔"

—— اس پر تو وہ لاجواب سی ہو گئی۔

انجم کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی ہتک کر دی۔ جیسے
کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ جس کا نشان مٹ گیا مگر احساس
باقی تھا۔ جیسے کسی نے راہ چلتے چلتے مردہ لاش پر ٹھوکر لگا دی۔
اور اس نے فوراً گویا سنبھالا لیا۔ اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ
بھرپور وار کرنے کے لئے تیار ہے۔

"بہن میں نے کیا کیا —— دیش کے لئے —— سنو میں نے
اپنا سہاگ دیا ہے تم نے اپنے آپ کو پیش کیا —— اپنے کو کون نہیں

پیش کر سکتا۔ اپنی قربانی کون نہیں دے سکتا۔ تم نے لڑکی ہو کر دیکھا ہے
بیوی ہو کر نہیں ——"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور مسکراتی چلی گئی —— انجم نے فاتحانہ
انداز سے دیکھا —— امّی بھی پڑوس میں گئی ہوئی تھیں ورنہ شاید اتنی
آزادی سے نہ کہہ سکتی —— وہ لڑکی جا چکی تھی اور انجم اطمینان کا سانس
لے رہی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا —— اس نے ہرا دیا، آخر کو اپنا سا
منہ لے کر رہ گئی نا —— اور اس کے دل میں یہ بھی خواہش پیدا ہوئی تھی
کہ نسیم آجائے تو وہ اپنی جیت کا قصہ سنائے مگر وہ اس سے کس طرح
کہہ سکے گی کہ وہ نسیم سے کتنی محبت کرتی ہے۔ محبت زندگی کی بڑی
حقیقت ہے۔

اور اس طرح غلامی کے دن نسیم نے جیل میں کاٹے —— انجم کی
آنکھوں میں پچھلے دنوں وہ چھ ماہ کس طرح چھ ہزار سال کی طرح کٹے
اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان چھین لی۔ اس نے
اپنی کاپی میں ایک ایک کر کے چھ ماہ کی تاریخیں لکھ ڈالی تھیں۔ پھر روز
وہ ایک دن کاٹتی تھی۔ دن میں بار بار گنتی تھی کہ کتنے دن اور باقی
ہیں۔ وہ پھر گنتی۔ شاید اس نے غلط گنا ہو۔ مگر ایک دن بھی کم نہ ہوتا
اور نسیم جیل میں اپنا سارا وقت کتابوں کی نذر کرتا۔ وہ صبح سے شام تک

پڑھتا، اس کی جیل کی زندگی امن و سکون میں گذر رہی تھی اور انجم گویا سزا بھگت
رہی تھی بالآخر چھ ماہ گذر گئے اور آخری روز اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے
وہ جاگ رہی ہے، وہ آج ہی تو زندگی میں پہلی بار مسکرائے گی جیسے مسلسل
کئی راتوں کے بعد سورج نکلنے والا ہے، خوشی اس کے سینے میں کروٹ
لے رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ننھے کا وجود اس کے جسم میں حرکت
کیا کرتا تھا ــــ جیسے مسلسل اندھیری راتوں کے بعد ماہ نو نکلتا ہے!

پھر پولیس کی لاٹھی کی چوٹ ــــ اس نے رات دن ایک کر دیئے
صبح سے شام تک اس کے پاس بیٹھی رہتی، "موت کے منہ سے چھڑا کر
لاؤں گی، میں موت سے جنگ کروں گی۔ ابھی قوم ہی کو نہیں مجھے بھی
تمہاری ضرورت ہے" ــــ وہ نسیم کو اچھا کر کے ہی رہے گی۔

اس طرح غلامی کے دن ختم ہوئے، آزادی مل گئی۔ ہندوستان
آزاد ہو گیا۔ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ پاکستان اور ہندوستان میں
ــــ اور اسی روز اس نے اپنے گھر میں چراغاں کیا۔ اس نے بھی قومی پرچم
لہرائے۔ اس نے ہندوستان کے نقشے پر عقیدت کے پھول چڑھائے۔
اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے جن میں ہندوستان کا ماضی
نہیں اس کی زندگی کے دو سال جھلک رہے تھے۔ مگر وہ آج خوش تھی
وہ خوش آیند مستقبل کی منتظر تھی جو آج اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔

اس نے دروازے کے باہر دیکھا تو موٹر دوڑ رہی تھی۔ جلوس گذر رہے تھے۔ بازار کا شور بڑھ رہا تھا۔ زندگی خوشی میں دیوانی ہو رہی تھی وہ سڑک دوڑ رہی تھی اور آزادی کو گویا اس نے دیکھ ہی تو لیا تھا۔ مگر جب نسیم کو اس نے افسردہ دیکھا تو ملول ہو کر کہا:

"میرے نسیم تم اُداس ہو! کیا میں بھی اُداس ہو جاؤں؟ کیا اتنے دن بعد بھی ہم کو مسکرانا نہ چاہیئے؟"

اور نسیم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "نہیں انجم تم اُداس مت ہو تم مسکراؤ۔ مگر آج مجھے شہید یاد آ گئے۔ وہ نامور شہید جنھوں نے آج کے دن کے لئے اپنی جانیں دیں جن کے نام تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جائیں گے اور وہ بے نام شہید جن کے نام تاریخ نہ گنوا سکے گی، وہ جنھوں نے نوّے سال تک اپنی جانیں دیں جو ان گنت ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ بھی اُداس ہو گئی — مگر پھر دوسرے لمحے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے پھوٹنے لگی۔ شہیدوں کی یادگاریں بازاروں میں نصب کرنے والے پتھرو! انسانی دلوں کے احساسات سے تم ہمیشہ بے حس رہو گے۔

پھر آزادی مل گئی۔ نسیم بھی خوش تھا۔ وہ دن ختم ہو گیا اس لئے کہ دوسرے دن آئیں جن میں غربت دور ہو، افلاس ختم ہو، قحط اور بیماریاں

دنیا سے دور بسیں اور زندگی کی خوشیاں مستقل ہو جائیں۔

لیکن وہ دن زندہ جاوید نہ ہو سکا اور انجم نے سنا کہ آزادی کے بعد انسان، انسان نہ رہ سکا وہ ہندو اور مسلمان ہو گیا۔ وہ چیرے باز اور خونخوار ہو گیا — وہ شیر اور بھیڑیا ہو گیا، یہ شیر کے رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں بھیڑیا نہیں رہ سکتا — یہ مسلمان کی بستی ہے یہاں ہندو نہیں رہ سکتا۔

اس طرح سارے پنجاب میں آگ لگ گئی۔ وہ بھڑک گئی اس کے شعلوں نے دلی کو بھی اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ انجم نے یہ سب کچھ سنا۔ — نسیم کا زیادہ تر وقت پھر کانگرس کے دفتر میں گذرنے لگا۔

اس نے کہا "انجم انسانیت خطرے میں ہے، ہمارا حال ہی نہیں بلکہ ہمارا مستقبل بھی خطرے میں ہے — ہمارا ننھا خطرے میں ہے"

انجم کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ "نسیم! تم جاؤ میں ننھے کو اپنی آغوش میں آرام سے رکھوں گی اس کی فکر مت کرو"

پھر تو وہ روز رات کو دیر سے آنے لگا۔ شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ روز یہ خبر آنے لگی کہ مسلمان پاکستان جا رہے ہیں۔ ہندو ہندوستان آ رہے ہیں بڑے بڑے رہنما عوام کو دھوکا دے کر بھاگنے لگے۔ برسوں کی پالی ہوئی قومیت کا جنازہ نکل رہا تھا۔ محمد علی اور گاندھی کے لاشے نکل رہے

تھے — ترنگے کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ سارا شہر ہی نہیں سارا ہندوستان اس کے دھوئیں سے گھٹ رہا تھا۔ وہ دھواں جو پنجاب اور دلی کی آگ سے اٹھ رہا تھا۔

ہندوستان ——————— ہندوؤں کا

پاکستان ——————— مسلمانوں کا

انسان ——————— کسی کا نہیں

لاکھوں کی تعداد میں انسان اپنے آبائی وطنوں کو چھوڑ کر آنے لگے۔ انجم نے سب کچھ سُنا۔ اس نے سُنا کہ پاکستان سے لاکھوں ہندو اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے آئے۔ اس نے سُنا کہ کس طرح ننگی عورتوں کی پریڈ کرائی گئی۔ کس طرح ان کی چھاتیاں کاٹی گئیں۔ بچے بلکتے رہے اور مائیں سسکتی رہ گئیں۔ پھر کس طرح پولیس اور فوج نے پناہ گزینوں کی پوری ٹرین کو نیست و نابود کر دیا — بہیمیت انسانیت پر ہنس رہی تھی۔ عورتوں کی عزت — لڑکیوں کی عزت — عصمت سر بازار لوٹی جا رہی تھی، بالکل اسی طرح جیسے چور اور ڈاکو گھروں کو لوٹتے ہیں۔

انجم کانپ گئی۔ ننھا اس کے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا تھا۔ اس کو ذرا بھی تو خیال نہ آیا کہ جب برسوں کی پالی ہوئی تہذیب مٹی میں مل گئی تو پھر چند ماہ کا ننھا ——

انجم کی آنکھوں کے سامنے وہ قافلے گردش کر رہے تھے مسلمانوں اور ہندوؤں کے قافلے جب وہ گھروں سے صرف اپنی جانوں کو لے کر نکل پڑے ـــــ اس کے جی میں تو آیا کہ کوئی بم ـــــ ایٹم بم گرے اور انسانوں کی یہ نسل ختم ہو جائے۔ آخر انسان کس حسرت پر جئے، کس امید پر زندہ رہے ـــــ تہذیب و تمدن کے تمام عناصر ختم ہو چکے ہیں۔ انسان جانوروں سے بھی بد تر ہو گیا ہے ـــــ وہ بھیڑوں اور بکریوں کے گلے کی طرح اپنے آبائی شہروں سے نکل پڑا ہے۔ جہاں اس کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں بھی اس کو آواز دیں تو وہ واپس نہ آئے گا۔ وہ انسانوں کے قافلے بنا کر بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح بڑھ رہا ہے۔ نامعلوم منزل کی طرف ـــــ وہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے نہیں ـــــ وہ زندگی کی نعمتوں کو گھر کے اندر دفن کر کے زندگی کی بڑی سے بڑی قدروں کو ڈھونڈنے کے لیے نکلا ہے۔ وہ سکون کی تلاش میں پیٹ چھوڑ کر نکلا ہے۔ انجم کو انسانوں سے نفرت سی ہونے لگی، اُف یہ کتّے ہیں۔ انسان نہیں۔ یہ موت سے بھاگے ہیں۔ نہ جانے کیوں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کیا اب بھی ان کو دُنیا سے کچھ اُمیدیں وابستہ ہیں۔

انجم کا جسم پھٹا جا رہا تھا جیسے اچانک کسی نے اس کو دھکا دے دیا اور وہ اس شور و شر کی دنیا میں واپس آ گئی۔ وہ قافلہ جا رہا تھا مگر

سڑک پر بدستور سناٹا تھا۔ مردہ لاش بے حس پڑی تھی۔ کاش اُسے وہاں سے کوئی اٹھا کر لے جاتا۔

"اری لونڈیا کہاں گئی۔ جا کھانا کھالے۔ نہ جانے کیا ہو کر رہے گا بھلی ہوئی یہ آزادی بھی"۔ آخری فقرہ سن کر وہ چونک پڑی اس نے اپنے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھائے۔

"کیا ہے امّی؟ میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی"۔

کچھ ہو وہ آج نسیم کے ساتھ کھانا ضرور کھلائے گی، نہ جانے کیا ہو کل تک وہ زندہ بھی رہے یا نہیں۔ حال آں کہ اس کے شہر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ مگر پھر بھی ایک خوفناک سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ آج دو ہزار پنجابی اس شہر میں آ گئے۔ اس شہر میں کیا وہ تو سارے ہندوستان میں پھیل رہے تھے اور ایک لمحہ کے لئے تو اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جیسے سارا ہندوستان پنجاب ہو جائے گا۔

وہ کھڑے کھڑے ایک طرف کو سمٹ گئی جیسے وہ شعلے پھیلتے پھیلتے اس کے گھر کے قریب آ گئے تھے، اس نے گھبرا کر ننھے کو چارپائی پر ڈال دیا۔

"بیٹا! اس سے اچھے تو وہی دن تھے جب انگریز راج تھا۔ چین سے رہتے تھے"۔

انجم کو آج نہ جانے کیوں امی پر غصہ نہیں آیا اور آیا بھی تو اس کے

آثار اس کے چہرے پر نہ تھے، وہ لاجواب سی ہورہی تھی۔ ورنہ اتنی سی
بات ایک جھگڑے کے لئے کافی تھی اس نے امی کو کتنا سمجھانا چاہا، نسیم
کی قربانیوں کا واسطہ دیا۔ اس کی جیل کی زندگی کی تکلیف کا احساس
دلایا اور تب کہیں امی نے غلامی سے بیزاری کا اظہار کیا۔ مگر آج پھر ان
کا بوڑھا دماغ تجربوں کے سہارے چل رہا تھا۔ اداسا تجم کچھ نہ بولی۔
"امی ـــ ابھی تک نہیں آئے کتنی دیر ہوگئی۔ چاند بھی مدھم
پڑ گیا۔ نہ جانے کوئی حادثہ ـــــ"
"بدشگون ـــــ اس کے جی میں تو آیا اپنا منہ پیٹ ڈالے
ـــ پھر فوراً ہی تو اسے آہٹ سنائی دی۔ جواب پیروں کی چاپ
میں بدل گئی اور پھر وہی مانوس آواز۔ خون اس کی شریانوں میں
دوڑنے لگا۔ دوبارہ آواز آئی اور وہ دیوانہ وار دوڑی ــــ اس
کا پاؤں دوپٹہ سے اُلجھ گیا اس نے اسے بھی پھینک دیا۔ دوپٹہ اور
بھی دیر کرتا ہے۔ کتنی دیر سے وہ کھڑے ہوں گے ـــ آن کی
آن میں وہ دروازہ پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا مگر وہاں بھی کوئی
نہ تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی ـــــــ سڑک سا کن پڑی تھی
اور پھر اس کو دکھائی دیا جیسے منجمد خون پھر بہنے لگا ـــ فضا میں
خون کی بو پھیل گئی۔ اور پھر وہی مسلسل اور موت پرور خاموشی ـــــ

اس کو ایسا محسوس جیسے زندگی پناہ لینے چلی گئی ہے۔ جیسے وہ سہمی سہمی کسی جھروکے سے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے جھانک رہی ہے۔ اس کے کان ہرنی کی طرح اس آواز کی جستجو میں محو ہو گئے۔ اس کے وہ کان جو اکثر آپ ہی آپ گونجتے ہیں۔ پھر ان آنکھوں کے سامنے کوئی تصویر پھر جاتی ہے اور یہی تو وہ کان ہیں جن کی مدد سے وہ تنہائی میں بھی باتیں کرتی ہے وہ باتیں جو نسیم سے یوں نہیں کہتی ـــــ کتنا ہی سوچتی ہے کہ آج جی کھول کر باتیں کروں گی۔ محبت کے نغموں کی جھنکاریں سناؤں گی۔ ـــــ اپنے بربط کے ان تاروں کو چھیڑوں گی مگر پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی اس کے الفاظ اس کی آنکھوں میں سمٹ کر آجاتے۔ نغموں کی جھنکاریں بے آواز ہی رہتیں۔ بربط کی آواز تاروں میں الجھی ہی رہتی۔ محبت بے زبان ہوتی ہے۔

"انجم ـــــ" پھر وہی مانوس آواز ـــــ وہی نرم اور گداز آواز جو فضا میں گونج رہی تھی۔ انجم چونک پڑی ـــــ اب وہ آگئے یہ سناٹا اور خاموش اور بے حس لاش ـــــ جس کا خون منجمد ہو گیا تھا جو دوڑتے دوڑتے تڑپتی ہوئی گر پڑی تھی۔ جس کے ماتھے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ جس کے سینے پر موٹریں چل رہی تھیں ـــــ وہ دوڑتی ہوئی دروازہ پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا مگر وہاں پر مکمل خاموشی

وہ کانپ اٹھی جیسے وہ لاش دیر سے پڑی ہوئی چیخ رہی تھی۔

"انجم ـــــ انجم"

"نسیم ابھی نہیں آیا" اس نے یونہی سوچا۔ "اب وہ کبھی نہ آئے گا ـــــ" مگر پھر فوراً اس کو اپنے واہمہ پر غصہ آیا ـــــ کیوں نہیں آئے گا؟ وہ ضرور آئے گا۔ اس کے جسم میں سنسنی پھیل گئی اور پھر تمام ہڈیاں ایک دوسرے سے پیوست ہوگئیں ـــــ وہ ضرور آئے گا۔ وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

دروازہ کھلا رہا۔ پھر ایک سایہ زمین کے سینے پر لہرایا اس کو خیال آیا کہ جیسے وہ سایہ نہیں بلکہ بے جان لاش تھی۔ جس کا خون منجمد ہوگیا تھا مگر اس وقت وہ متحرک تھی۔ وہ بولنا چاہتی تھی۔

"کوئی ہے؟" سائے نے آواز دی۔

"کون ہے؟" وہ سہمی ہوئی بڑھی۔

"یہ نسیم صاحب کا گھر ہے؟" سائے نے پوچھا

اس کو آپ ہی آپ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں دو وجود ایک دوسرے سے بحث کر رہے ہیں۔

"نسیم زندہ ہے!"

"نسیم مر چکا ہے!"

"نسیم کو کسی نے مار دیا۔ شہر میں فساد ہو گیا ہے ___ ہندو مسلم ___ مسلمانوں کی زندگی محفوظ نہیں ___ آپ لوگوں کو یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔"

"یہ گھر ___" اس کے جسم میں جیسے جان نہیں رہ گئی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اگر دروازہ نہ پکڑ لیتی تو شاید گر پڑتی۔ اس کے پاؤں اس جگہ سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولیں ___ بے جان لاش تو نہیں واہمہ تو نہیں، نسیم کبھی مر نہیں سکتا ___

"بہن اس گھر کو جلد چھوڑو، سارے شہر میں آگ لگ رہی ہے زندگی، ناموس، عزت، سب کچھ خطرے میں ہیں، میں دفتر سے آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں۔ میں نسیم کا دوست کملؔ ہوں۔"

"کمل" ___ اس کو یقین ہو گیا ___ امی ہائے امی!"

ضبط کے تمام بند ٹوٹ چکے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی اور پھر امی کی آواز نے ان چیخوں میں معنی بھی پہنا دیئے تھے۔

کمل نے دونوں کو چلنے کے لئے کہا ___ یونہی چلنے کو ___ نہ جانے کیا ہو؟ شہر میں فساد کی آگ پھیل چکی ہے جس کی چنگاریوں نے اس گھر کو بھی جھلس کر رکھ دیا۔

عقل اور دل میں بھی بحث نہ ہو سکی اور وہ تالا لگا کر چل نکلے۔

امی نے اپنی جائے نماز بھی چھوڑ دی تھی۔ انجم دروازہ کی اس اوٹ کو بھی بھول چکی تھی۔ جہاں اس نے زندگی کی کتنی شامیں نذر کر دی تھیں ــــ انھوں نے چلتے وقت اجداد کے اس گھر کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا جہاں ان کی روحیں رقص کر رہی تھیں ــــ جس کی ویرانی پر وہ ماتم کناں تھیں ــــ جہاں پر نسیم کے بچپن کی غوں غاں کی آوازیں گونج رہی تھیں، وہ گھر بھی خاموش تھا وہ بھی انھیں واپس نہیں بلا رہا تھا

وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے، ایک رہبر اور دو راہرو۔ ــــ آنسوؤں کے قطرے انجم اور امی کے چہروں پر منجمد ہو رہے تھے۔ وہ چیخ نہیں رہی تھیں مگر ان کے دماغ چٹک رہے تھے۔ ان کے دلوں میں طوفان آرہا تھا۔ اور امّی کا پیر کسی لاش سے ٹکرایا۔ "میرا نسیم" مگر وہ مردہ لاش یونہی پڑی رہی۔ اس کے ماتھے پر دھول اٹی ہوئی تھی خون بالکل منجمد ہو گیا تھا۔

"میرا بیٹا"

"نہیں ماں آگے چلو۔ کسی اور کی لاش ہے" کمل نے کہا۔

اور امی کی آنکھوں کے آنسو اور بھی خشک ہو گئے۔ انجم کے آنسو بھی ختم ہو چکے تھے۔ راستے میں کتنی لاشیں ملیں۔ وہ شرنارتھیوں کے کیمپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ انسان نہیں

ہیں۔ وہ بھوکوں اور بے سروسامانوں کو اپنے گھر میں پناہ دے کر ثواب لوٹنے والی نہیں ہیں۔ وہ خود دوسروں کے شرنوں میں پناہ ڈھونڈنے آئی ہیں۔ ان کی خیراتیں بیکار ثابت ہوئی تھیں۔ آج وہ خود ایک فقیر تھے۔ ایک کنگال —— برسوں کی پالی ہوئی تہذیب کے چھلکے اُتر چکے تھے۔

"جلد چلئے شہر کی حالت کتنی خراب ہو گئی ہے یہ لاشیں دیکھ رہی ہیں۔ اب ہم کو جلد کیمپ پہنچنا ہے۔ اور اُن کے قدم تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

بہت دور سے اندھیرے میں اُنھوں نے دیکھا کہ کچھ آدمی چلے آرہے ہیں۔ مسلح —— کمل ٹھٹھک سا گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ لوگ آپہنچے۔

"ٹھہر جاؤ —— رکو، تم کون ہو؟"

"میں انسان —— نہیں ہندو ہوں ہندو۔"

"اور یہ مسلمان عورتیں تمہاری ماں اور بیویاں ہیں جو انھیں لے جارہے ہو؟" بھیڑ میں سے کسی نے للکارا۔

"جلدی بتاؤ انھیں بچا کر لے جانا چاہتے ہو۔ انھیں ہمارے حوالے کردو"

"نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا" کمل نے بڑے جوش سے کہا۔

"مار ڈالو دیکھتے کیا ہو۔ غدار ہے غدار!"

فضا میں ایک دھماکا ہوا اور کمل کی بے جان لاش سڑک پر پڑی تھی۔ اس پر خون کی بوندیں بھی نہ ابھریں۔ اس پر دھول بھی نہ پڑ سکی پھر دو نوجوان ان کی زندہ لاش پر ٹوٹ پڑے۔

فضا میں پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ امی کی لاش بھی گر پڑی۔ جلے تمام چیتھڑے چیتھڑے اڑ گئی تھی ـــــ ایک ننگی عورت وہاں کھڑی تھی جس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہ تھا۔

"انجم ـــــ" اس کے کانوں میں اس بار نہ گونج سکا۔ وہ نسیم کو بھی بھول چکی تھی، اپنے محسن کی لاش پر بھی نہ رو سکی۔ وہ امی کی لاش پر بھی ایک نظر نہ ڈال سکی۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ننگی تھی۔ اس کا بچہ اس کی گود سے چھین لیا گیا تھا۔ مستقبل خطرے ہی میں نہیں بلکہ موت کی گہری نیند سو رہا تھا اور وہ ننگی تھی۔ اس کی چھاتیوں کا دودھ بھی خشک ہو چکا تھا ـــــ اس کی آنکھوں میں محبت مر چکی تھی۔ اگر کوئی چیز باقی تھی تو نفرت ـــــ انسانوں سے نفرت، وہ انجم جس نے دروازے سے باہر قدم نہ نکالے تھے۔ جس کی نظریں بھی آنچل سے باہر نہ سرک سکی تھیں آج اس کو یہ درندے پھٹی پھٹی نظروں سے گھور رہے تھے ـــــ وہ تیسرے دھماکے کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ وہ اسے بہیمیت سے نجات دلا سکتا تھا۔ اس کی یہ

خواہش نہ تھی کہ کوئی اس کی جان بچائے کوئی اس کو پناہ دے وہ تو صرف ایک آواز کی منتظر تھی۔ مگر دیر تک وہ آواز سنائی نہ دی۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ گر پڑی۔ اتنی نگاہوں کی وہ تاب نہ لا سکی۔

ذرا سی دیر میں وہ زندہ لاش وہاں سے اٹھالی گئی تھی۔

"سنبھل ـــ" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر فضا میں یہ آواز گونج بھی نہ سکی، وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ گولی کے دو تڑاخے فضا میں گونج رہے تھے۔ اور تیسری کی جگہ درندگی اور وحشت تھی۔

انسان خدا کی تخلیق نہیں۔ وہ آدم اور حوا کی اولاد نہیں ـــ وہ مسیح اور محمد ـــ نانک اور گوتم کا منکر ہے۔ وہ درندوں سے پیدا ہوا ہے، وہ انسانیت کی طرف نہیں بلکہ درندگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نقطہ کے گرد گھوم رہا ہے۔ جس نے اس کو انسانیت کے حلقہ میں پہنچایا ہے۔ اب وہ حلقہ پھر غائب ہو گیا ہے صرف نقطہ باقی رہ گیا ہے۔

بھیڑ چھٹ چکی تھی ـــ لاشیں ہی لاشیں ـــ اور ہر طرف وہی سناٹا ـــ وہی جان لیوا سکوت اور موت پرور خاموشی ـــ بے جان لاشیں جن کا خون منجمد ہو گیا تھا ـــ اور سڑک بھی چلتے چلتے رک گئی تھی جیسے کسی نے اس پر بھی حملہ کر دیا تھا ـــ انسانوں کی لاشیں آنکھیں پھاڑے پھاڑے خدائے بزرگ و برتر سے کچھ پوچھنا چاہتی تھیں مگر وہ بھی خوف سے کہیں چھپ گیا تھا۔ مندروں کے ناقوس اور مسجدوں کی اذانیں بھی فضا کے سناٹے اور خوف میں گھل گئی تھیں۔

"یہ دھرتی کے بیٹے"

اور جس وقت گاؤں میں ریلا آیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے دریا میں طوفان آرہا ہے۔ باڑھ آرہی ہے اور مکان کے مکان ڈوبتے چلے جارہے ہیں اور پھر ––– آن کی آن میں ساری بستی کے جھونپڑوں سے پانی کی لہریں پھوٹ پڑیں۔ سائیں سائیں دریا کی طوفانی لہریں ––– یا پھر مغرب کی گھاٹیوں میں کوئی آندھی آرہی تھی، گہری سیاہ آندھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری بستی دھول سے پٹ گئی۔ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اور پھر وہ طغیانی، وہ طوفان: وہ آندھی آئی کہ ہرے بھرے پیڑ سوکھ کر جھاڑ ہوگئے۔ پتے تو کہاں۔ ڈالیاں بھی جل کر خاک ہوگئیں۔ کھیتوں میں دھول اڑنے لگی جیسے یہاں کبھی کسان کا ہل نہیں چلا تھا۔ رات کی سنہری چاندنی میں کسان نے اپنے میٹھے گیتوں سے ان کھیتوں کو سیراب نہیں کیا تھا ––– ہاں ان کھیتوں

میں جیسے کبھی دانہ نہ پڑا ہو۔ سالہاسال کی خشک بنجر زمینیں۔ اور گھروں کے چھپڑ زمین کو آ لگے۔ سارا گاؤں جیسے کسی نے بھاڑ میں بھون کر رکھ دیا ہو۔ پچاس پچاس جھونپڑوں کا گاؤں آنِ واحد میں ویران ہو گیا — اور وہ یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ یہ سب کچھ کیا ہوا کیوں ہوا۔ یہ بھگوان کا قہر ہے یا اس کا کرم۔ مگر وہاں آگے سوچنے کی مہلت ہی کہاں تھی جو کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے۔ آنِ واحد میں یہ سب کچھ ہو گیا اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کے کڑے تھے اور ان کڑوں میں بھاری بھاری زنجیریں لٹک رہی تھیں — رام دیال نے اپنے ہات کو جھٹکا دیا چھن، چھن از نجیر کی آواز ہوئی اور رام دیال چونک پڑا اور اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی، بوڑھی ماں اور اس کا لڑکا سب گھر سے باہر کھڑے تھے اور سب ہی کے ہاتوں میں وہی لوہے کی ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے گھر کے اندر قدم نہ رکھ سکتے تھے اور پھر اس نے نظر اٹھائی تو ساری بستی پر اندھیارا چھا چکا تھا۔ صرف لوہے کی زنجیروں کی چھن چھن سنائی دے رہی تھی۔ سارا گاؤں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور انسان جانوروں کی طرح بندھے کھڑے ہوئے اس طوفان کو تک رہے تھے۔ لاٹھیاں، گولیاں اور پھر یہ لوہے کی بھاری بھاری زنجیریں رام دیال کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے اپنے ہات لٹکا دیئے وہ جھونپڑی کی طرف کان لگا کر کچھ سُن رہا تھا، کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور یہ آواز لحظہ بہ لحظہ دھیمی ہوتی جا رہی تھی — اور

پھر اچانک فضا میں نہ جانے ان کے خیال میں ایک دھماکا ہوا اور وہ اس کی جانب دوڑ پڑے۔ چاروں انسان دو مرد اور دو عورتیں اور پھر — ان کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی تھیں — چار لاشیں جن میں دو مر چکے تھے اور دو موت کی راہ تک رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں — اور رام دیال نے اپنے کھیت کی جانب نظر ڈالی۔ وہ کھیت جس میں گیہوں کی سنہری بالیں شاید اب کبھی جنم نہ لیں گی۔ سورج کی کرنیں ان کھیتوں پر اب کبھی سونا نہیں بکھیریں گی — اور رام دیال کی آنکھیں جیسے کہہ رہی ہوں: "میں تم کو بھگوان کے سپرد کرتا ہوں۔ جب تک بس چلا میں نے تم کو اپنے خون اور پسینے سے سینچا تمھاری کوکھ سے اناج اُگایا، اپنا اور دوسروں کا پیٹ بھرا۔ تم نے مجھے کبھی بھوکا نہیں مرنے دیا — مگر آج میں تم کو چھوڑ کر جا رہا ہوں مجھے معاف کرنا اگر مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہو تو اسے بھی بھلا دینا — اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔

رام دیال کاشتکار تھا جس کے گھر میں کل ملا کر چھ آدمی تھے۔ ماں۔ بیوی، جوان لڑکا، جوان لڑکی اور ایک سب سے چھوٹا لڑکا جو ابھی تیرہ سال کا تھا — یہ تھا ان کا گھرانہ جو سب کے سب مل کر کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ ادھر بیج ڈالا اور اُدھر فصل آنکھوں ہی آنکھوں میں جوان ہو گئی جیسے کسی نے دُلھن کی اوڑھنی پر سونا بکھیر دیا ہو — اور پھر غلّہ سے کھلیان بھر جاتے

اور پھر اس اناج کا بیشتر حصہ زمیندار اور بنیے کے یہاں پہنچ جاتا تھا ۔ یہ تھی
ان کی زندگی جو کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی اور اس بار جب فصل کے اچھے ہونے
کے تمام امکانات پیدا ہوئے تو قسمت کی خوبی دیکھیئے کہ بسنت کے پانی نے
کھڑی فصل کا ناس کر دیا اور جو سارے گاؤں پر بیتی اس سے رام دیال اکیلا
کیسے بچ سکتا تھا سب کے رنگ اُڑ گئے جیسے سنہری بالوں پر کہر پڑ گیا ہو۔
ان کی محنت مٹی میں مل گئی اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ کھیتوں میں خالی بالیں
لہرا رہی تھیں حالانکہ جب ان میں دانا پڑا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا
گاؤں سنہرا ہو جائے گا۔ ہر طرف گیہوں ہی گیہوں ہوگا ۔ اور گاؤں والوں
کے دل اندر ہی اندر چٹکیاں لینے لگتے ۔ ان کی آنکھیں خوشی سے ناچ اٹھیں۔
بچے ماؤں کو لپٹتے ۔ "ماں چل کے دیکھیں کھیت میں کیسا ناچ ہے ، ماں اب
کے بڑا غلہ ہوگا۔ اب کے مجھے ایک کُرتا بھی بنوا دینا ماں" ۔۔۔ ماں جھڑک کر
کہتی ۔ "پرے ہٹ ۔ جب دانہ کوٹھی میں آجائے جبھی ناچنا" اور رام دیال
کی ماں زبان سے تو یہ کہہ رہی تھی مگر دل میں تو اس کے بھی یہی تھا کہ اب کے
فصل اچھی ہو رہی ہے اور وہ رام دیال کو سنانے کے لئے آپ ہی آپ کہنے لگی۔
"اب کے اگر بھگوان نے فصل اچھی کر دی تو لونڈیا کا ٹھکانہ لگانا ہے
پھر دیکھا جائے گا"۔

ہاں بھگوان کرے اب کے فصل اچھی ہو جائے۔ سیانی لڑکی ہے ہمارے

بھی پیر کی بیڑی کھلے"۔ بہو بھی گائے کو سانی دیتے دیتے بول پڑی۔
رام دیال کی ماں کو سب سے زیادہ اپنی رام پیاری کی فکر تھی جو اب
کے دھان کے بونے پر اٹھارہ سال کی ہو جائے گی۔ کتنے ارمان تھے جو اس
نے رام پیاری کے لئے اٹھا رکھے تھے اور ہر بار وہ یہی سوچتی کہ اس بار وہ
اس کے بیاہ سے فرصت پا لے گی۔ مگر بھگوان کے حکم کے آگے اس کی ایک نہ
چلتی۔ بالیں سنہری ہوتیں، کھیتوں میں ہریا پڑتی، اور پھر اناج سے کھلیان
بھر جاتے۔ پر کوٹھی تو تب بھرتی جب دانا گھر میں آتا۔ وہ تو وہیں سے
وہیں زمیندار اور بنئے کے گھر پہنچ جاتا۔ بچے کھچے دانے گھر میں آ پڑتے
کس کی مجال تھی جو کوئی زبان بھی ہلا سکتا۔ زمیندار اور بنئے کا تو ذکر ہی
کیا ان کے نوکر ہی کھال کھینچ ڈالتے۔

"واہ رے بھگوان"۔۔۔ رام دیال ایک ٹھنڈا سانس بھرتا
اور آگے کچھ نہ کہتا یا اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا کہ وہ کیا کہے۔ پر اس بار وہ
اپنی رام پیاری کا بیاہ ضرور کرے گا۔ چاہے زمیندار اس کی کھال ہی کیوں
نہ کھینچ لے۔ اور اس بار جب رام دیال نے بھی دیکھا کہ گیہوں کی بالوں
میں دودھ بھرنے لگا تو اس سے بھی نہ رہا گیا اور اس نے اپنے دل کی بات
زبان پر لا کر رکھ دی۔ "ارے رامو کی ماں۔۔۔ اب کے دیکھنا میں کیسے
اپنی رمی کو دلہن بناتا ہوں کہ سارا گاؤں دیکھتا رہ جائے گا۔۔۔ ہاں۔۔۔

میں شہر سے باجہ لاؤں گا اور دھوا دھو باجہ بجے گا اس گھر کے سامنے۔ رامو کی ماں کوئی تو بیٹا بیاہ کے روتا ہو گا پر میں اپنی بٹیا کا جیون بنا کے باجے بجواؤں گا۔ پر اب کے فصل ذرا ٹھکانے کی ہو جائے۔ ویسے تو اپنی دھرتی سونا اُگلتی ہے۔ پر رامو کی ماں اوپر والے کی دیا چاہیئے"۔

رام دیال نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر کسانوں کے چہرے اُتر جاتے اس لئے کہ وہاں ان کا قابو نہ چل سکتا تھا۔ بادل گھر گھر کر آتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے اب دھوا دھو بارش ہوئی اور پھر کھیتوں کی جوانی پھٹ پڑی۔ مگر ان بادلوں کا کیا ہو جو کھیتوں پر آ آکر جھومتے ہیں اور پھر روئی کے گالوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں اور ننھے ننھے پودے لہرا لہرا کر رہ جاتے جیسے وہ ان بادلوں کی منت کرتے ہوں کہ آؤ اور اپنی امرت بوندوں سے ہمیں سیراب کر دو۔ وہ دیکھو رام پیاری جوان ہو گئی۔ اب کے ہمیں اس کا بیاہ کرانا ہے۔ کتنا بڑا پاپ ہو گا۔ اگر تم یوں ہی گذر گئے۔ اور پھر رام پیاری کا بیاہ نہ ہو سکے گا۔ دو چار ہی بوند گرا دو نا۔ مگر یہ داتا جو اس وقت سچ مچ کے اَن داتا ہو جاتے یوں ہی لہراتے ہوئے چلے جاتے۔ کیسی کیسی شکلیں بناتے ہوئے اور گیہوں کی یہ بالیں ان کا منہ تکتی رہ جاتیں۔ وہ مایوس ہو کر اپنا سر جھکا دیتیں۔ ان کے خشک ہونٹوں پر جیسے انگارے لوٹنے لگتے۔ آخر دھرتی بھی کتنا زور لگائے۔

"اب کے بھی میری رمی کا بیاہ نہ ہوگا کیا بھگوان"۔
اور کسانوں کی آنکھیں آسمان تکتے تکتے پتھر کی ہو گئیں پر آسمان
سے بوند نہ ٹپکی۔ جیسے کسی نے اس آسمان پر تانبا جڑ دیا ہو یا سورج
ہرے بھرے کھیتوں کو جھلسا رہا تھا اور گیہوں کی دودھ بھری بالیں بادلوں
کا انتظار کرتے کرتے سر جھکانے لگیں دانے پیاس سے مرنے لگے اور ایسا
معلوم ہوا کہ جیسے کوئی سرکاری حکم آگیا ہو۔ نرم نرم کونپلیں بسنت رت
کی چند بوندوں کو ترس گئیں اور اس وقت سارے گاؤں پر جیسے ایٹم کے
ذرات برس پڑے ۔۔۔ اور ان ذرات میں جیسے سارا گاؤں بھسم ہو گیا۔
رام دیال کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کو پہاڑ پر سے کسی نے دھکا دیا
اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے آرہا۔ اور رام دیال ہی نہیں۔ سارا گاؤں ہی جھلس کر
رہ گیا ۔۔۔ کسی کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کریں۔ دوا کا سوال ہی نہ تھا
اور دعائیں بیکار ہو چکی تھیں۔
جب سارے گاؤں کا یہ حال ہو تو اکیلا رام دیال ہی کیا کرتا۔
کال تو سارے گاؤں ہی کے لئے آیا تھا ۔۔۔ "اب کے بھوکے مر جائیں گے
بھگوان" کسان اپنے کھیتوں کو دیکھ کر کہتا اور جب کھیتوں میں ہنسیا پڑی
تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ہر طرف گھاس ہی گھاس ہے۔ بھوسا ہی بھوسا ہے
جیسے ان کھیتوں میں کسی نے دانا ہی نہ ڈالا ہو۔ سیاہ سیاہ بالیں اور ان میں

کوئی کوئی مرا ہوا دانا۔

"اے بھگوان، میں اس سال بھی اپنی بچی کا بیاہ نہ کر سکی" رام دیال کی ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رمّی کی طرف دیکھا جو انگلیوں سے زمین کرید رہی تھی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہے، 'داوی تو میرا بیاہ کبھی نہ کر سکے گی۔ جب ان کھیتوں میں گیہوں بھوسا ہو گیا تب بھی نہیں اور جب یہ کھیت سونا اگائیں گے تب بھی نہیں۔ آخر زمیندار کے لڑکے کی بھی تو دلہن آنی ہے۔ بنئے کو بھی تو لڑکی بیاہنی ہے۔ تیری رمّی کس گنتی میں وہ تو کسان کی بیٹی ہے اس کا بیاہ بھی ایک سندر سپنے سے زیادہ نہیں۔ تیری عمر کے اسّی سال سپنے ہی دیکھنے میں بیتے۔ شاید یہ ایک آخری سپنا اور ہے جس کو دیکھتے ہی دیکھتے تو ختم ہو جائے گی۔

رام دیال کی ماں کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا اور اس نے جلدی سے اپنے چرخے پر نظریں گاڑ دیں۔ اور وہ اس کو تیزی سے گھمانے لگی۔ گھوں گھوں — گھوں — اس کا دھیان چرخے میں لگ گیا۔ تکلا گھوم رہا تھا۔ روئی کے تار بن بن کر پونی کی شکل اختیار کر رہے تھے۔

"رمّی ان پونیوں کو تو اٹیر دے بیٹا" دادی بولی۔

"آتی ہوں دادی" رام پیاری جھٹ اٹیرن لے کر دادی کی پیڑھی

کے پاس آبیٹھی اور رام دیال ہنسیا اٹھائے کبھی اپنی ماں اور کبھی اپنی رتی کو دیکھتا ہوا کھیتوں کی طرف چل دیا۔

کٹائی ختم ہو گئی۔ رام دیال کے کھیت میں بمشکل تمام چھ سات من اناج نکلا اور اس میں سے کچھ زمیندار کے گھر نکل گیا اور اس کے بعد جب بچے کھچے دانے لے کر وہ گھر پہنچا تو اس کے سامنے رام پیاری کی موہنی صورت تھی۔

بس یہی دانے نکلے بابا؟" رام پیاری نے گیہوں کے دانوں کو ہات میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ ہمارا ہی کیا۔ سارے گاؤں کا یہی حال ہے۔ بیج بھی نہ لوٹا پر کیا کریں بھگوان کو یہی منظور تھا۔ اب بیٹا عزت آبرو سے یہ سال کٹ جائے"۔

"اب کے کیا ہوگا بیٹا" رام دیال کی ماں بولی۔

"کیا ہوتا ماں۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالیں گے۔ پر اس بار بھی میں اپنی بٹیا کا بیاہ نہ کر سکا"۔ اور رام دیال کا سر جھک گیا۔ سچ مچ کیا وہ اپنی رام پیاری کا کبھی بیاہ نہ کر سکے گا۔

ابھی وہ یہ سوچ بھی نہ سکے تھے کہ دوسری فصل کے آنے تک کس طرح بال بچوں کا پیٹ بھر اجائے گا۔ کہ سرکاری حکم دندناتا ہوا آپہنچا۔

"منگل پور کے کسانوں سے سرکار غلہ وصول کرے گی۔ اور سرکاری آدمی گاؤں میں آنے لگے اور جب کسانوں نے یہ حکم سُنا تو انہوں نے جھٹ

عرضداشت بھجوادی کہ اس بار فصل کا یہ حال ہے کہ سرکار ہماری مدد کرے تو ہم اگلی فصل کا بندوبست کر سکیں گے ورنہ ہم لوگ تو بھوکے مرجائیں گے۔

اور یہ سنا تھا کہ منگل پور کو چاروں طرف سے طوفان نے گھیر لیا۔

منگل پور میں بغاوت ہو رہی ہے۔ سرکار کا تختہ اُلٹنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

منگل پور باغیوں کا اڈا ہے۔

منگل پور میں ان کے لیڈر رہتے ہیں۔

اور پھر یہی ہوا کہ منگل پور کے نہتے کسانوں پر مسلح فوجوں نے حملہ کر دیا۔ آندھی اور طوفان بن کر گاؤں پر ٹوٹ پڑے۔ بھگوان کے بھیجے ہوئے طوفان سے بھی ہیبت ناک طوفان لے کر اور پھر فضا میں تڑاتڑ گولیاں سنسنانے لگیں اور لوگ چلاتے رہ گئے۔

"سرکار ہماری بات تو سُن لی ہوتی"

سرکار جو اپنے گھر میں ہوں وہ لے جاؤ پر ہمیں ستانے سے کیا فائدہ۔ ہم محنت مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔ ہمارے بال بچوں کو ہات نہ لگاؤ" پر اس طوفانی اندھیارے میں ان کی آواز کون سنتا تھا ننھے ننھے دیئے بھی تو بجھ چکے تھے اور ہر طرف اندھیارا دیو کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ کالا دیو۔ بڑے بڑے دانت جن سے انسانوں کا خون

بہہ رہا تھا۔ چڑ چڑ۔۔۔ چڑ۔۔۔ وہ بڑی آسانی سے انسانوں کی ہڈیاں چبا رہا تھا
۔۔۔ اور ننھی منی جانیں اس کے پنجوں میں موت کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور
جب وہ قہقہہ لگاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں گولیاں تڑتڑا رہی ہیں۔
"سرکار یہ میری کنواری بٹیا ہے اس کو ہات نہ لگاؤ" رام دیال چیخا۔
اور پھر فوجیوں نے اس کی لڑکی کو ننگا کر دیا۔ اور رام دیال کی آواز
اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں برابر سنائی دے رہی تھی۔
"یہ میری رام پیاری ہے۔ سرکار مجھے اس کا بیاہ کرنا ہے۔۔۔ اب
میں فصل کا انتظار بھی نہ کروں گا اور اپنی رانی بٹیا کا بیاہ کر دوں گا۔ اس
کو ہات نہ لگاؤ سرکار اس کی بے عزتی نہ کرو۔۔۔" اور فوجی یکے بعد دیگرے
اپنے جسم کی آگ بجھاتے رہے اور رام پیاری چلاتی رہی۔۔۔ رام دیال
اور زور سے چیخا۔
"اے بھگوان اس وقت تو کہاں ہے۔۔۔ تو بھگوان ہو کر میری
بچی کی عزت نہیں بچا سکتا۔۔۔" اور رام دیال کی آواز آسمان کی بلندیوں
سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔
رام پیاری کی چیخ نے بھی جواب دے دیا اور وہ کراہتی رہی۔۔۔
اور پھر اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ دانتوں
میں بھنچ کر رہ گئے اور آنکھیں جو کنول کے پتوں سے زیادہ سندر تھیں اب پتھر

کے دو ٹکڑے نظر آرہے تھے اور پھر رام پیاری کے مردہ جسم کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا ــــ اب یہ کتّے اس کے چھوٹے بھائی کی طرف جھپٹے ــــ عورت اور مرد کی تمیز اس ایک لمحہ کے لئے اٹھ گئی تھی ۔ اور پھر معصوم رامو بھی اسی طرح چیختا رہا اور پھر وہ بھی کراہنے لگا ــــ

جھونپڑے کے اندر مکمل خاموشی تھی ــ کچھ سپاہی گیہوں کے تین بورے اٹھائے لئے جا رہے تھے اور باہر رام دیال برابر چیخ رہا تھا ۔ سارا گیہوں لے جاؤ پر میری لڑکی کو چھوڑ دو ۔ مجھے اس کا بیاہ کرنا ہے ــــ اور رام دیال کے سر پر ایک فوجی نے بندوق کا کندا مارا ــــ کون گولی خراب کرے ــــ اور رام دیال بھی مر گیا ــــ رام دیال کاشتکار ــــ اپنی کنواری لڑکی رام پیاری کا باپ ــــ

لے پالک

اس کے رہن سہن کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ "لے پالک" ہے بلکہ ریشماں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سدا ہی سے اس گھر میں پلی بڑھی ہے۔ پھر شکل وصورت بھی ماشاءاللہ ایسی تھی کہ دیکھتے ہی بنے اور اب تو سن کا تقاضہ بھی تھا۔ سولہ سترہ برس کی ہونے کو آئی تھی۔ لڑکی ذات سیلاب کی طرح بڑھتی ہے، دن دونی رات چوگنی۔ یوں تو پہلے ہی سے اس کا رنگ گورا چٹا تھا اور اب تو اس میں سرخی بھی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور چہرے کا تو کہنا ہی کیا۔ روز بروز اس کے گالوں میں چمک آتی جا رہی تھی۔ لیکن اس عمر کے باوجود اس میں وہی بچپنا تھا۔ دس بارہ سال کی لڑکیوں کی سی اچھل کود۔ سارے گھر میں دھما چوکڑی مچائے رہتی۔ لیکن کام میں اتنی تیز کہ اُدھر زبان سے نکلا اور اِدھر ریشماں کام میں جُٹ گئی۔ جس دن سے گھر میں قدم رکھا تھا خوب بے تکلف ہو گئی تھی۔ ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ خود کو بھی بھول گئی تھی کہ کہیں اور پیدا ہوئی ہے۔ بلکہ بات بات میں بچوں کی سی ضد۔ بچوں کی طرح ٹھنکنے لگتی۔ اور جس بات کی بھی ضد کرتی کر کے چھوڑتی۔

طلعت کے لئے سینڈل آیا۔ بس اس نے اپنے پرانے چپل اتار کر پھینک دیئے۔
"میں تو نہیں لٹکائے پھروں گی ان لیتروں کو ـــــ مجھے تو سینڈل چاہیئے ایسا ہی جیسا طلعت باجی کا سینڈل ہے۔ بس میں ایسے ہی لوں گی، اب سب نے بہترا سمجھایا کہ اگلے مہینے آجائے گا مگر اس کی ایک نہیں ہزار نہیں ـــــ دوپہر کو تو اس غم میں اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ آخر مجبور ہو کر لانا ہی پڑا۔
اور اس کی ایسی ہی باتوں پر تو سارے گھر کو پیار آتا تھا ـــــ اور اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو بچہ سمجھ کر چپ ہو جاتے آخر عقل ہوتی تو ایسی باتیں کیوں کرتی ـــــ اور پھر وہ شوخ بھی تھی کہ ادھر چائے کی پیالی ہات میں لی ادھر چھوٹ کر چھنا چھن بکھر گئی۔ اور وہ چپ، مگر جب بیگم غصہ ضبط کرتے ہوئے کہتیں۔
"ارے کیسے ٹوٹ گئی یہ پیالی منحوس! ـــــ"
تو جواب میں اس نے نور جہاں کی طرح دوسری تو نہ توڑی۔ لیکن ایسا بھاڑ سا منہ کھول دیا۔ جیسے اس کے ٹوٹنے سے وہ گھبرا گئی ہو۔
"کیا بتاؤں بھابی، بس ہات سے چھوٹ گئی" اس کی سہمی ہوئی شکل

دیکھ کر بھابی کو بھی رحم آگیا ___ اور وہ پگھل گئیں۔

"اونہہ ___ پرے کو ٹوٹ بھی جانے دے۔ چینی کی پیالیاں ٹوٹا ہی کرتی ہیں:" اور اب جو اسے شہ ملی تو بس پھر کیا تھا۔ اس کے ٹکڑے کوڑے میں پھینکتے پھینکتے اس کے جسم میں بجلی کی سی پھرتی آگئی۔

"بڑی کمزور ہوتی ہیں یہ مٹ گئی پیالیاں" ___ اور بیگم کا پلڑا چڑھنے لگا، اس کا جملہ سن کر سارا گھر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ بیگم کا غصہ بھی اتر گیا۔ نسیم کا تو یہ حال کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"اری ریشماں، بڑی کمزور ہوتی ہیں یہ پیالیاں" ___ پھر تو طلعت اور نسیم نے کئی دن اس کو پریشان کیا۔ ایک آدھ بار تو اس نے کہہ بھی دیا کہ کمزور نہ ہوتیں تو ایسے ایک اشارے میں ٹوٹ جاتیں:" پھر اس کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور چڑھنے لگی ___ اور بیگم یہ کہہ کر چپ ہو گئیں کہ ___ "بچاری یتیم ہے، اس کا دنیا میں بیٹھا ہی کون ہے، جو کچھ ہیں ہم ہیں۔ اب اس پر ڈانٹ ڈپٹ کر کے کون اس یتیم کا صبر اپنے اوپر لے ___ اور یہ ریشماں کی سب سے بڑی ڈھال تھی۔ کتنا بڑا نقصان کر دے مگر کوئی اسے کچھ نہ کہتا! آخر اللہ ماری یتیم جو تھی ___ پھر یہ بھی کہ جہاں یہ بات تھی وہاں یہ بھی تھا کہ کسی کام سے تامل نہ تھا اور پھر اتنی پھرتی سے کام کرتی کہ سارا گھر دیکھتا رہ جاتا ___ تھکنا کسے کہتے ہیں یہ تو وہ جانتی ہی نہ تھی

اور یہی وجہ تھی کہ آج آٹھ سال اس کو اس گھر میں آئے ہوئے ہو گئے تھے
اور چوبیس گھنٹے گھر میں اسی کے نعرے لگتے تھے اور وہ دو پیروں پر تگنی کا
ناچ ناچتی تھی۔ کسی نے آواز دی۔ فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہو ئی۔ ایک
کام چھوڑنا اور دوسرے میں ہاتھ ڈالنا تو اس کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔
اور جسم میں پھرتی اس غضب کی تھی کہ برتن مانجھ رہی ہے اور طلعت نے
آواز دی "اری ریشماں ذرا ادھر تو سننا"۔ اور وہ برتن چھوڑ چھاڑ انھیں
ہاتھوں سے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اور اس کے کام میں لگ گئی لیکن ابھی
وہ کام بھی ختم نہ ہوا تھا کہ نسیم نے آواز دی۔ " اری ریشماں کدھر ہے
یہاں تو آنا۔" اور گھر کی خاموشی کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی اس کے
دندناتے ہوئے پیروں کی آواز سنائی دیتی۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر
سب لوگ سمجھ جاتے کہ ریشماں ہو گی۔ جو نہ جانے زمین سے کب کا بدلا لے
رہی ہے۔ تبھی تو جب بیگم بہت خوش ہوتی تو۔" اری ریشماں سنبھل کر
چل، آخر یہ زمین بھی کیا کہتی ہو گی۔ کوئی اس پر اس طرح چلتا ہے"۔ لیکن
ریشماں کو بھلا ایسی باتوں کی کہاں پرواہ ہوتی۔ وہ تو بس ایک کان سے
سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی۔ جیسے کسی نے کچھ کہا ہی نہیں اور پھر
ذرا سی دیر میں دیکھو تو ریشماں کوئی نہ کوئی کام کا کام لئے بیٹھی ہے۔
بے کار تو اسے کسی نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ایسی لڑکی کو بھلا ڈانٹنے سے

کیا فائدہ۔ بس اُسے تو اپنے کام سے کام۔ سمجھانے کی تو بات ہی اور ہے۔ اگر کوئی ڈانٹ بھی دے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چکنا گھڑا تھی وہ تو جس پر ایک بوند بھی پانی کی ٹھہر جائے تو بات ہے۔

ریشماں کی سب سے بڑی کمزوری اس کا نہانا تھا۔ چنانچہ آج جب بیگم نے اُسے نہانے پر زور دیا تو بس۔

"بھابی تمھارا احسان مانوں گی۔ مجھے نہانے کے لئے مت کہا کرو۔ گرمی میں تم کہو گی کہ نل کے نیچے بیٹھی رہ ریشماں تو سچ کہتی ہوں اگر ایک منٹ کو بھی اٹھوں نل کے نیچے سے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ مگر بس جاڑے میں مجھ پر رحم کیا کرو۔"

لیکن بیگم اس کی عادت سے واقف تھیں انھیں جب اسے نہلانا ہوتا تو پھر کسی شرط پر نہ چھوڑتیں، وہ کتنا ہی منہ بناتی، جاڑے کا واسطہ دیتی۔ بخار چڑھا لیتی۔

"بھابی نہ جانے مجھے کیوں سردی لگ رہی ہے۔ کہیں بخار تو نہیں ہو گیا" وہ زکام سے سوں سوں کرنے لگتی۔ زکام ہو گیا ہے بھابی جان بس دوا منگوا دینا" اور بیگم اس کی ان تمام چالبازیوں سے واقف ہو گئی تھیں۔

ہاں آنے دے بھیا کو۔ میں آپ دوا منگوا دوں گی۔ ابھی تو نہا لے، پانی چولھے پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اور ہاں دیکھنا

بالوں کے لئے کھلی بھی بھیگی رکھی ہے۔ خوب اچھی طرح بالوں کو صاف کرلینا۔ کتنے گندے ہو رہے ہیں۔ سارے کے سارے الجھے ہوئے ہیں"
— مگر اس کے جواب میں اس نے اپنے سر کو اس زور سے جھٹکا دیا جیسے بھابی کوئی بڑی بے وقوفی کی بات کر رہی ہیں اور آہستہ سے اُس نے کہا۔ "بس تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی میری بات" اور پھر ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "بھابی بس آج کے دن معاف کرو۔ کل کے دن ضرور نہا لوں گی — اور بال بھی خوب اچھی طرح دھو لوں گی۔ پھر دیکھنا سوکھ کر کیسے نکھرتے ہیں یہ بال"

"اچھا نہانے نہیں جائے گی، اُٹھوں پھر، بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں گز بھر کی زبان ہو گئی ہے۔ کچھ کہتی نہیں اسی لئے یہ حال ہے" اور اب تو وہ اور بھی مجبور ہو گئی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ اب یہ کام کرنا ہی ہے تو وہ پھر ریشماں ہو گئی اور اس کے جسم میں وہی پھرتی آگئی۔ اور اپنی عادت کے مطابق جلدی جلدی کپڑے لے کر پانی رکھ غسل خانے میں پہنچ گئی۔ اور کسی نہ کسی طرح اس مصیبت کو بھی حل کر ڈالا۔ چنانچہ آدھے گھنٹے کے اندر ہی جب کہ بیگم ابھی صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں وہ جھپاک سے جو بھاگی ہے تو بیگم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اری ریشماں یہ کیا آفت آگئی ہے بنرے اوپر — بس بنیائن

پہن کر نکل بھاگی" اور ریشماں کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے گز بھر کی زبان نکالی اور "ہائے اللہ" کہہ کر اُلٹے پاؤں غسل خانے میں پہنچ گئی۔ اور بیگم نے چلاّنا شروع کر دیا۔

"کیا مصیبت ہے یہ لڑکی بھی، جوان لڑکے لڑکیوں کا گھر ہے اور اس کے نام کو شرم و حیا بھی نہیں رہ گئی، آخر کوئی حد ہوتی ہے ۔ مانا کہ ہر کام جلدی ہو مگر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ ہر کام ادھورا ہو۔ اب بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ خالی بنیائن پہنے چھاتی ہلاتے نکل کھڑی ہوئیں" اور اس وقت ریشماں کا حال کچھ نہ پوچھو" کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" پھر جو چپ چاپ نکلی ہے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کئی دنوں کے لئے فرصت ہو گئی خاموشی سے سر جھکائے بدن چرائے ہوئے طلعت کے کمرے میں جا پہنچی ادھر طلعت کا یہ حال کہ تکئے میں منہ دیئے اوندھی پڑی تھی ہنسی کے مارے بُرا حال ــــ ریشماں کا منہ لال ہو رہا تھا، سارا جاڑا کافور ہو چکا تھا۔" ارے طلعت باجی کیا ہو گیا ہے"؟

"پہن آئیں جمپر ــــ بڑی اچھی لگتی ہوں گی بنیائن پہنے"!

"نہیں مانو گی، کہوں بھابی سے "؟

ادھر بیگم صاحبہ نے آواز دی" ارے ری ریشماں کہاں گھس گئی تھی جلکے چل اِدھر بال سکھالے، تو میں کنگھی کر دوں"!

"اب پھر ایک اور آفت آگئی" وہ جھنجھلا گئی ـــ مگر اسے ایک نئی ترکیب سوجھی
"بھابی! تم اپنا کام کرو میں طلعت باجی سے کرا لوں گی کنگھی ـــ
لیکن جب مصیبت آتی ہے تو کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ طلعت نے بھی ٹکا سا
جواب دے دیا۔

"جاؤ امی سے ہی گندھوا و اپنا جونڈا ـــ مجھے آپ فرصت نہیں ہے
اور پھر جوئیں بھری ہوں جس سر میں، اس میں تو میری جوتی ہات لگاتی
ہے ۔بس چلو یہاں سے" اور اب اس کے سامنے کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس
کے کہ کمرے سے چپ چاپ نکل جائے۔ دل ہی دل میں وہ طلعت کو کوستی
جا رہی تھی ـــ "مجھ سے بھی تو کوئی کام پڑے گا۔ بتا دوں گی میں بھی" ـــ
اور وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی بیگم کے سامنے آ کر بیٹھ گئی ـــ اور پھر بیگم کے
ہاتھ میں اس کے لمبے لمبے بال آ گئے تھے اور وہ انھیں پھریرا کرتی جا رہی تھیں
ساتھ ہی ساتھ ان کا لکچر بھی شروع ہو گیا۔

"اری ریشماں ـــ اب جوان ہو گئی ہے، بچی نہیں رہی، خدا عقل
کے ناخن لیا کر۔ اب تیرے وہ دن نہیں رہے کہ جہاں چاہے پھرا کرے
آخر یہ ڈھائی گز کا دوپٹہ کس دن کے لئے ہے اور یہ جوتے جس کے لئے تنے
فعل کھیرے تھے انھیں بھی کبھی پہن لیا کر یا خصم کے سر پر بجانے کے لئے
رکھے ہیں ـــ تو سمجھ گئی نا۔ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا کر۔"

"مگر بھابی تم کچھ کہو یہ دوپٹہ مجھ سے نہیں اوڑھا جاتا، کام کاج میں برابر الجھتا ہے اب تم ہی بتاؤ ہر وقت کیسے گلے میں ڈالے رہوں۔" یہ سننا تھا کہ بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔

— "دیکھ ریشماں آج بتائے دیتی ہوں کہ اب جو میں نے تجھے بغیر دوپٹے کے دیکھا — کام ہو یا نہ ہو مگر دوپٹہ ضرور ہونا چاہیئے۔ کبھی طلعت کو بھی بغیر دوپٹے کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا ہے — تجھے تو نام کو بھی شرم نہیں رہی، اب دیکھوں کیسے نہیں اوڑھا جاتا —"

" اونھ — طلعت باجی کا اور میرا مقابلہ — ان کی بات اور ہے" وہ ٹھنکنے لگی۔

" نہیں ریشماں! میں نے کہہ دیا ہے اور بس یہ میرا فیصلہ ہے اب دیکھوں تجھے بغیر دوپٹہ کے" — اب تو مجبوراً اسے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ بیگم کا غصہ وہ اچھی طرح جانتی تھی یا تو کبھی غصہ آتا نہیں یا جب آتا ہے تو کسی کے قابو کی نہیں رہتیں، اسی لئے ریشماں نے چپ چاپ رہنے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی۔ لیکن بیگم کا بھی تو یہ ہے کہ ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع کر دیتی ہیں —

" اور ہاں دیکھو، اب نسیم کے کمرے میں بھی اس طرح بے دھڑک نہ گھس جایا کر اکیلے!"

"اکیلے نہیں تو پھر جب کام ہو تو کیسے جایا کروں، کوئی اور نوان کے کام کو ہات لگاتا نہیں۔ اب اسی دن مجھے بخار آگیا اور ان کے کالج جانے کا وقت ہوگیا، مگر کسی نے بھی نوان کو کھانا نہ دیا۔ خود جاکر انھوں نے باورچی خانہ سے نکالا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر طلعت باجی نے جو ڈانٹ بتائی تو میں بھی پڑی دیکھتی رہی آخر کیا کرتی تم ہی بتاؤ۔ اور طلعت باجی بس کرسی پر بیٹھی سویٹر بنتی رہیں ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اون اور سلائی ایک طرف رکھ کر کھانا ہی نکال دیں۔ اب تم ہی بتاؤ پھر کیسے لے کر جاؤں پھر اس میں بڑا ہی کیا ہے ——————" اس نے بے خبری میں گردن کو جھٹکا دیا اور بیگم نے جھنجھلا کر کہا۔" ارے ٹھیک سے سر کر۔ گھمائے چلی جا رہی ہے سر اِدھر اُدھر۔ بڑی آئی ہے کام کرنے والی سدا سے تو نے ہی تو اس گھر کا انتظام کیا ہے۔ تو نہ ہوتی تو بس کام تھوڑا ہی ہوتا۔ بڑی بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگی ہے۔"

اور وہ چپ تھی کہ طلعت کمرے سے نکل پڑی۔

"کیا چخلی ہو رہی ہے میں سمجھتی ہوں اس ریشماں کی بچی کو۔ ذرا موقع ملا اور یہ اِدھر کی اُدھر لگا دیتی ہے۔ کس روز نہیں ملا تھا بھائی جان کو کھانا، ادھر آ تو بتاؤں تجھے۔" یہ سننا تھا کہ بیگم نے بھی رُخ بدل دیا "اچھا چلو اپنے کمرے میں چلی آئیں لڑنے کے لئے۔ سچ تو کہہ رہی ہے تم

سے کوئی کام ہوتا ہے۔ بس اون اور سلائی لئے بیٹھی رہو۔۔ یہ بھی نہیں ہوتا
کہ صبح شام بھیّا کو کھانا ہی کھلا دیا کرو، اور اب میں کہے دیتی ہوں کہ آج
سے نسیم کا سارا کام تجھے کرنا پڑے گا۔ ریشماں نہیں کرے گی۔"
مگر یہ سن کر تو ریشماں بجائے خوش ہونے کے اور اُلجھ گئی۔ اسے تو
بھائی جان کا کام کرنے میں خوشی ہوتی تھی، اس لئے کہ نسیم اس سے بڑی
اچھی طرح پیش آتا تھا اور کوئی کام ہوتا تو بڑے پیار سے کہتا۔ یہ نہیں کہ
طلعت کی طرح، جیسے، ٹوکری میں بھر کر کوئی کوڑا گھورے پر انڈیل دے۔
"ریشماں! لے یہ دوپٹہ جا کر دھوپ میں ڈال دے"، کیسا ہی ضروری
کام کرتی ہو۔ مگر بیگیاں کا حکم ہے۔ ٹال تھوڑا ہی سکتی ہے چاہے کسی کا
کام ہو یا نہ ہو مگر ان کا ضرور ہو اگر کہیں کہہ دیا کہ آپا جی ذرا ٹھہر جاؤ ابھی
تھوڑی دیر میں کر دوں گی ۔۔ تو بس آفت۔
"بس آنا میرے کمرے میں تو میں بتاؤں گی" جیسے سارے گھر میں
انھیں کا تو ایک کمرہ ہے۔ اور ادھر بھائی جان، اللہ میاں کی گائے۔ کیسی
ہی غلطی ہو جائے۔ مجال ہے جو کچھ کہہ جائیں۔ اب اسی روز ساری سیاہی
میز پوش پر الٹ گئی، لیکن ان کے ملتے تو کچھ ہوا ہی نہیں۔۔ بس یہ کہہ کر
چپ ہو گئے۔" میز پوش اس وقت تک پاک نہیں ہوتا جب تک اس
پر سیاہی نہ گرے ۔۔ لے کر کونے میں ڈال دے اور بکس میں سے نیا

نکال لا۔ جس روز امی کہیں جائیں گی اسی خاموشی سے دھو لینا۔"

اور وہ چور ہو گئی تھی۔ کتنی دیر اسے اپنے ہاتھوں پر غصہ آیا جنہوں نے اچھی بھلی دوات رکھی ہوئی الٹ — دی — بلکہ اگر بھائی جان اس روز غصہ میں ناراض ہو لیتے تو شاید اس کو خیال بھی نہ ہوتا۔ لیکن ان کے کچھ نہ کہنے سے اسے دن بھر الجھن ہوتی رہی، حالانکہ ایسا کوئی نقصان بھی نہ ہوا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہو، تمام دن اسے وہی خیال بار بار آتا رہا — اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زبان پر ٹافی رکھی ہوئی ہے۔ میٹھی میٹھی ٹافی اور وہ اسے چوس رہی ہے، کتنی خوش ذائقہ ہوتی ہے یہ کمبخت ٹافی بھی۔ ایک دو ٹافی میں جتنا چاہے کام کرا لو۔ اور وہ خوشی خوشی ہر کام کر ڈالتی اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ سب کے سامنے کھاؤ اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی کیا کھا رہا ہے — اب ایک روز جب نہ جانے کس خیال میں میٹھی وہ ٹافی چوس رہی تھی کہ طلعت نے دیکھ لیا۔ طلعت بھلا کہاں معاف کرنے والی تھی۔ پوچھ ہی تو بیٹھی — "کیا کھلائی ہو رہی ہے بیگم صاحبہ" اور ریشماں نے ایک ہی مرتبہ میں اس کو ختم کر لیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ دو منٹ کوئی بات ہی نہ کی۔ آخر بیگم کو پوچھنا پڑا کہ کیا بات ہے —

کچھ نہیں طلعت باجی کی عادت جانتی ہی ہو، ہر بات میں مین میخ

نکالتی ہیں، اب دیکھو لگادی چوری کہ کیا کر رہی ہو ۔۔۔ سچ مچ اللہ کی قسم میں نے باورچی خانے سے ایک لقمہ بھی جو چھپا کر کھایا ہو تو سمجھو زہر کھایا ہے" اور اس نے بھاڑ سا منہ کھول دیا ۔۔۔ "لو دیکھو کیا کھا رہی ہوں" لیکن وہاں دھرا کیا تھا ساری زبان صاف رکھی تھی۔ پانی سے دھلی ہوئی ۔۔۔ اور طلعت بات کہہ کر چور ہو گئی اور وہ بھی کوئی چوری تھوڑا ہی لگا رہی تھی۔ مگر چور کی داڑھی میں تنکا تھا ۔۔۔ اللہ بیگم نے طلعت کو ڈانٹا۔

"طلعت بڑی بد زبان ہو گئی ہو بھلا ایسے بھی کوئی کہتا ہے مانا کہ چھوکری اچھال چھکا ہے مگر ایسی عادت اپنی ریشماں کی نہیں ۔۔۔ اگر کھا بھی لیا تو کوئی غیر تھوڑا ہی ہے ۔۔۔ تمھاری اپنی بہن ہے گھر میں رہتی ہے تو کیا پیٹ کہیں اور رکھ آئے گی ۔۔۔" اور ریشماں خوش ہو گئی اور پھر ۔۔۔ دوسرے لمحے اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ طلعت نے اسے کچھ کہا تھا وہ تو طلعت سے اتنی محبت کرتی تھی کہ ذرا سا بھی گھڑی بھر کو اسے اداس یا پریشان دیکھا بس لپٹ گئی اس کے گلے میں اور وہ بھینچتی رہ جاتی ۔۔۔ ائے ہٹ پرے کو ۔۔۔ جوئیں چڑھاؤ گی میرے ۔"

اور وہ بس یہی کہے جاتی ۔۔۔ میری اچھی سی باجی، ناراض ہو گئیں تم تو ۔۔۔"

"چل دور ہو ۔۔۔ میں ناراض واراض نہیں ہوں ۔۔۔ میں تو یونہی

کہہ رہی تھی کہ کیا کھا رہی ہو — ؟"

"بس اتنی سی بات تھی — مگر سچ مچ باجی تم نے کہا تو ایسے ہی تھا جیسے میں چھپ کر کھا رہی تھی کوئی چیز" اس نے منہ پھلاتے ہوئے کہا جیسے اس کے تصور ہی سے اس کو کوئی کچوکا لگا ہو۔

"اچھا کہا تو کرلے کیا کرلی" ہے، بڑی آئیں وہاں سے اتنی باتیں سنوا دیں امی سے اور اب بھی چین نہیں ہے —" وہ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"اچھا بس چپ رہو، طلعت باجی معاف کردو مجال ہے جواب کچھ کہوں" اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی — اور طلعت کو ہنسی آگئی۔

"بس اب تو چھوڑ دے میرا اچھا۔ جاؤ معاف کردیا" بس پھر کیا تھا اتنی سی بات ہی اس کو خوش کرنے کے لئے کافی تھی۔ طلعت باجی لاؤ تمہارے ہاتھ پاؤں دبا دوں" اور بیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے وہ بغیر جواب سنے ہی اپنے کام میں مشغول ہو گئی اور طلعت کو بھی اس کے سامنے ہار ماننی پڑی اور کام کرنے کی اسی ان تھک عادت کی وجہ سے نسیم کہا کرتا تھا۔

"طلعت اپنی ریشماں کو تو بس یہ سمجھو کہ جن ہے اپنے قبضے میں، وہی علاء الدین والا کہ آواز دو اور سامنے، پھر یہ بھی کہ جو کام کہو منٹوں

میں گر کے رکھ دیتی ہے اور تم سوچتی ہی رہ جاؤ کہ اب کون سا کام بتایا جائے وہ تو سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے، میں سوچتا ہوں کہ اس کے لئے ایک کتا پال لوں اور جب ریشماں کو کوئی کام نہ ہوا ور کام کو پوچھے تو بس یہی کہہ دوں کہ "جاؤ کتے کی دم سیدھی کرو" اور نسیم نے ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ ریشماں پٹاخ سے بول پڑی "ہاں بھائی جان ضرور پالو اور ایک بلّی بھی پالنا مجھے بلّی بڑی اچھی لگتی ہے نرم نرم میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ہوسی۔ سچ مچ بڑی اچھی لگتی ہے، تم پال لو، بس میں اس کی دیکھ بھال کیا کروں گی" ــــ وہ تو کچھ اور بھی بولتی کہ بیگم کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ گئی ــــ "اچھا بلّی پالیں گی نواب زادی ــــ چل تو سہی جڑ مل کہیں کی گیہوں بکھرا ہوا پڑا ہے اور تجھے بلّی پالنے کی لگی ہوئی ہے اور بس ایسے وقت میں اُسے یہ زبردستی کا کام بُرا لگتا وہ محسوس کرنے لگتی کہ گھر میں وہی اکیلی کام کرنے والی ہے۔ جیسے نوکر ہی تو ہے، اس کا جی چاہتا کہ کمرے میں جا کر چارپائی پر اوندھی ہو کر گر پڑے اور خوب دہاڑیں مار مار کر روئے۔ بھلا کوئی بات بھی ہے ایک منٹ کو بھی تو آرام نہیں جیسے کوئی انسان تھوڑا ہی ہے، ایک تو تھوڑی دیر کے لئے بھائی جان بات کرتے ہیں اور بھابی ایک نہ ایک کام لے کر بٹھا دیتی ہیں۔ ایسے ہی وقت انھیں کام بھی سوجھتا ہے ــــ اور اس کا جی بس اُلجھ ہی تو جاتا۔ طلعت باجی سے تو کام لے لیں

اس طرح پٹ سے نہ منع کر دیں تو کوئی بات نہیں۔ اسے پان والی بات یاد آجاتی ہے۔ جب امّی نے آواز دی تھی۔ "ارے طلعت ذرا مجھے ایک پان تو بنا دے" تو اس نے کیسا الٹا اسی پر ٹال دیا تھا اس لئے کہ بیگم صاحبہ خود تو اپنی سہیلیوں بہنولیوں سے گپ لڑا رہی تھیں اور الٹا اسی پر حکم چلا دیا۔

"اری ریشماں کہاں مر گئی۔ ذرا دیکھ امّی بلا رہی ہیں" اور خود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی اور وہ کوئی ریشماں تھوڑا ہی تھی جو ہر کسی کا کام کر دے اور دو منٹ کسی سے ہنس کر بات بھی نہ کر سکے۔

مگر ایسی باتیں ریشماں کتنی دیر سوچتی۔ ایسی باتوں کے سوچنے میں وہ دو تین منٹ سے زیادہ وقت ضائع نہ کرتی اور پھر جو کام میں لگتی تو بس پھر اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہتی بس کام سے کام ــــ پھر من دو من گیہوں اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتا تھا وہ تو بات کی بات میں صاف کر کے رکھ دیتی اور اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ ابھی ذرا سی دیر پہلے اسی گیہوں کے پیچھے اسے بیگم نے ڈانٹا تھا یا یہ کہ اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام لیا تھا اور گیہوں صاف کرتے وقت تو اگر اسے کوئی فکر رہتی تو بس یہی کہ کسی طرح یہ ختم ہو اور وہ دوسرے کام میں لگے۔ دراصل اس سے بہت دیر تک ایک جگہ بیٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ اور پھر یہ بھی کہ ہر نئے کام کو وہ دلچسپی سے کرتی تھی اور جہاں دلچسپی کا سوال ہو وہاں ہر کام اچھا ہوتا ہے ــــ اور پھر بھائی جان کا کام! وہ

بڑے فخر سے کہتی :-

"طلعت باجی اپنے بھائی جان سب سے اچھے ہیں۔ بڑے سیدھے ہیں کبھی کچھ نہیں کہتے۔ ایک تمھارا کام کر دلو دس باتیں الگ سے سنو۔ اور پھر بھائی جان ٹانی"۔۔۔۔ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیسی ٹانی۔۔۔؟" طلعت چونک پڑی جیسے کسی نے سوتے سے کچی نیند میں جگا دیا ہو۔

"ارے باجی، ٹانی تم نہیں جانتیں، اچھا اب ملے گی تو میں ضرور تم کو کھلاؤں گی۔ بڑے مزے کی ہوتی ہے ٹانی۔۔ بھائی جان بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ مجھے بھی کبھی کبھی دے دیتے ہیں۔۔۔ بڑی مزے دار ہوتی ہے یہ ٹانی طلعت باجی۔۔۔" وہ ٹانی کا ذکر کچھ اس طرح کر رہی تھی جیسے اس کا مزہ بار بار اس کے منہ میں آ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ طلعت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بات کرنے کے بجائے کچھ سوچ رہی ہے اور "اچھا" بھی اس نے کچھ اسی بے خیالی میں کہا۔۔۔ ریشماں کے لئے کسی بات کا چھپانا تو جیسے بالکل ہی ناممکن تھا اس لئے نہیں کہ وہ جھوٹ بول نہیں سکتی تھی بلکہ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ جھوٹ بولنا کسے کہتے ہیں اور پھر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ اس کو کیوں چھپایا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کے فوری غصّے کے ڈر سے

وہ یہ کہہ دے کہ" میں کچھ نہیں کھا رہی ہوں" اور اس کے ثبوت میں ٹافی سالم کی سالم نگل جائے مگر یہ بات اس کے ذہن میں کبھی نہ آسکتی تھی کہ وہ ٹافی کو چھپا کر کھلائے۔ بلکہ اگر اس کو کچھ ڈر تھا تو بس یہ کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس نے نعمت خانے سے کوئی چیز نکال کر کھائی ہے اور یہ بات سچ ہے کہ اس نے نعمت خانے سے کبھی کوئی چیز نکال کر نہیں کھائی تھی چنانچہ ٹافی کو چھپا کر کھانا اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ یہ اور بات ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں کو دکھا کر کھانے میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب جب کہ طلعت سے بھائی جان کی تعریف کر رہی تھی تو ٹافی کا ذکر نہ کرنا اس کی نظر میں ان کی ایک بڑی اچھائی پر پردہ ڈالنا تھا۔ اور اس طرح کسی کی بات پر پردہ ڈالنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جب طلعت نے منہ بنا کر پوچھا:۔

"اور کیا کہا تھا بھائی جان نے"

"کچھ نہیں کہتے کیا ــــ بس دے دی ٹافی ــــ میں ان کا اتنا کام بھی تو کرتی ہوں، اب مجھے چوڑیاں لا کر دینے کو کہا تھا بھائی جان نے ــــ کہنے لگے ایسے ننگے ہات اچھے نہیں لگتے ــــ تم اتار کر دیکھو اپنی چوڑیاں، ننگے ننگے ہات"

اور طلعت نے مسکرا کر کہا" اچھا تو چوڑیاں آرہی ہیں آپ کے لئے"

"اور کیا! تم بھی منگواؤ گی کیا، کہہ دینا بھائی جان سے، نہیں تو میں

ہی کہہ دوں گی ایک ساتھ آجائیں گی دونوں کے لئے" اس نے انتہائی معصومیت سے طلعت کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ در اصل ویسے بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ طنز کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ جب طلعت نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں میرے لئے منگوانے کی۔ بس تم ہی منگواؤ" بڑے پیر نکل رہے ہیں" — تو وہ بھی نہ سمجھ سکی کہ طلعت کس بات پر اس سے ناراض ہو گئی، آخر اس میں ناراض ہونے کی بات ہی کیا تھی۔ پھر چوڑیوں میں ایسی کون سی بری بات تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ طلعت کو ہو کیا گیا ہے۔

"اچھا جاؤ کہہ دینا — ہم بھی دیکھ لیں گے، اپنے بھائی جان ہی تو لاکر دیں گے۔ کوئی غیر نہیں، بڑی آئیں شکایت کرنے والی —" بھلا ریشماں کسی سے دینے والی تھی اور پھر جب کہ یہ بات اپنی جگہ پر سچ تھی کہ اس کے ہاتھ ننگے تھے۔ کتنے دن ہو گئے چوڑیاں پہنے، بیگم نے کئی بار کہا کہ اپنی ریشماں کے ہات میں چوڑیاں نہیں ہیں اور چوڑیوں والی آتی نہیں، اور یہ طلعت باجی ہیں کہ ان کا بس چلے تو یہی گھر میں رہیں جیسے اور کسی میں جان ہی نہیں ہے اور کسی کا جی نہیں چاہتا — اور پھر یہی نہیں طلعت نے بیگم سے کہہ بھی دیا۔ لیکن بیگم کے مزاج کو سمجھنا بھی آسان نہیں تھا، وقت کی بات ہے کون سی بات کیسی پڑتی ہے۔ جب انھوں نے سنا تو انھیں بھی کوئی تعجب نہیں ہوا

اس لئے کہ ان کے سامنے یہ کوئی خاص بات نہ تھی، چنانچہ وہ الٹا طلعت ہی پر بگڑیں۔

"اچھا جاؤ اپنا کام کرو، کون سا عیب ہے، اگر اس کے لئے چوڑیاں لا بھی دے گا، آخر ریشماں کے اور رکھا ہی کون ہے جواب اس کا خیال کریگا جو کچھ ہیں وہ ہم ہی ہیں — ارے اپنے گھر ہیں نہ تو بہن برابر ہے اتم کو تو آپ اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ پھر نسیم کا کام بھی تو کرتی ہے تم سے تو ہوتا نہیں، برابر اس کا خیال رکھتی ہے، کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتی —" اور طلعت اپنا سا منہ لے کر رہ گئی، حالانکہ اس کے جی میں تو آیا کہ وہ کہہ دے۔" اتی تم نہیں سمجھتیں کیا بات ہے۔ بڑھیا ہونے کو آئی اب یہ بات بھی مجھے بتانی پڑے گی کہ کیوں لاکر دینے کو کہا ہے، اور پھر چھپا کر اسے "نانی بھی تو کھلاتے ہیں"۔ مگر یہ سب وہ سوچتی رہ گئی۔ اس کی زبان سے کچھ بھی نہ نکلا، مگر اسے یہ تو تسلی ہو ہی گئی تھی کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا اتی کے کان میں بات تو ڈال دی، اب یہ ان کا کام تھا کہ وہ اس ریشماں کو روکتیں۔ مگر ان کے کچھ عقل بھی ہو تو بات ہے۔ اور وہ جل بھن کر رہ گئی۔ پھر نسیم نے سب کے سامنے چوڑیاں لا کر دیں، باریک باریک رنگین چوڑیاں اور اس وقت کچھ نہ پوچھو کہ ریشماں کا کیا حال تھا اسے اچھی سے اچھی چوڑیاں پہن کر بھی کبھی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی، جتنی آج۔

نسیم کی دی ہوئی ان چوڑیوں کو دیکھ کر، طلعت نے بہتیرا منہ بنایا
مگر جب امی کا سہارا ہو تو پھر کون کہہ سکتا تھا اور ریشماں نے جلدی سے
نسیم کا کوٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کمرے میں جا کر لٹکا آئی۔ اور یہی نہیں
اس نے نسیم کے منہ دھونے کے لئے پانی بھی لوٹے میں رکھ دیا" اور کچھ
کام ہے بھائی جان؟" اور بھائی جان نے بڑے پیار سے اس کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ "اری ریشماں جا پہلے چوڑیاں تو پہن لے" اور پھر
دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوڑیاں لے کر طلعت کے کمرے میں پہنچ گئی "طلعت
باجی لو پہنا دو مجھے چوڑیاں" اور طلعت کو بھی اس کی اس معصومیت
پر ہنسی آگئی اور وہ چوڑیاں پہن کر پھر اسی طرح اچھل کود میں لگ گئی۔
اب ایسی لڑکی کو آخر کوئی کیا کہے اور بیگم کا حکم تو اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا

"ہاں ریشماں دیکھ اب تو نسیم کے کمرے میں گھس جایا کر اکیلی!"

"طلعت باجی جو جاتی ہیں؟" بھلا ریشماں خاموش ہونے والی تھی

اور پھر اس کا کہنا بھی تو ٹھیک تھا۔ مگر بیگم نے تو طلعت ہی کو حکم دیا کہ
اب نسیم کا سارا کام اسے کرنا پڑے گا۔ ریشماں نہیں کرے گی۔

ریشماں کا منہ اُتر گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کے سارے
کام ختم ہو گئے۔ کوئی کام رہ ہی نہیں گیا۔

"تو پھر میں کیا۔ کروں گی؟"

"اری نگلی پتر سے لئے گھر میں کوئی کام ہی نہیں رہ گیا" اور وہ چپ ہوگئی اب اس کا جواب کیا دیتی ۔

"ادھر طلعت نے کہا:" اچھی بات ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے گھور کر ریشماں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو" اور پہن چوڑیاں" اس کے جواب میں اس نے بھی اسی انداز سے آنکھیں پھرائیں جیسے کہہ رہی ہو۔" ہاں مجھے بھی دیکھنا ہے تم سے ان کا کام کیسے ہوتا ہے پہلے اپنا کام تو کر لو" وہ چوٹی گندھوا صحن سے اٹھ کر چلی گئی۔ مگر اس کا دھیان طلعت کی طرف لگا رہا۔ بڑی بنی پھرتی ہیں! ہر کام کے لئے تو ریشماں ہے، اٹھ کر ایک گلاس پانی تو پیا نہیں جاتا۔ کام کریں گی" — "اری ریشماں بہن ذرا میرا بلاؤز تو صحن سے اٹھا لا" کام کے لئے کیا" ریشماں بہن" کہتی ہیں اور جب کام نکل جائے تو پھر وہی" ریشماں کی بچی" کتنی مرتبہ منع کیا کہ نام ٹھیک سے لیا کرو مگر بیگم صاحبہ کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا — اب چلی ہیں بھائی جان کا کام کرنے انھیں ضرور وہ ٹافی دے دیں گے دیں گے جبھی کہنا۔ کبھی جی لگا کر تو کام نہیں کرتیں اور چلی ہیں ٹافی کھانے اس کا دماغ الجھنے لگا اور ٹافی کا ذائقہ اس کے منہ میں پھر آنے لگا۔ وہ دیر تک یہی باتیں سوچتی رہی۔

پھر جب وہ اپنے کام میں لگ گئی تو اسے خیال بھی نہیں رہا کہ کوئی

بات ہو ئی تھی۔ سارا غصہ کافور ہو چکا تھا اور وہی پہلے والی ریشماں تھی
اور پھر اسی چستی سے کام میں سارا دن لگی رہی۔ یہاں تک کہ جب شام کو
سب کھاپی چکے تو جھپاک سے طلعت کے کمرے میں جا پہنچی۔

"کیا کر رہی ہو باجی، سر میں درد ہے کیا جو پڑی ہو" اور پھر حسب
دستور اسی تکلف سے اس کے سرہانے جاکر بیٹھ گئی اور ہلکے ہلکے طلعت
کا سر دبانے لگی۔

"باجی: آج تو کوئی اچھی سی کہانی سناؤ، وہی شہزادے والی"
"اری کون سے شہزادے والی" طلعت نے بے خیالی میں کہا۔
حالانکہ اس کا آج کہانی سنانے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔
"ارے وہی شہزادے والی اور کون سی"
"چل دور ہو، بڑی آئی شہزادے والی"
"سچ مچ طلعت باجی مجھے اس طرح دھتکارا مت کرو۔ جیسے کوئی
کتے کو ڈراتا ہے۔ بس مجھے یہی بات بری لگتی ہے اب تمھارا سر دباؤں اور
اوپر سے مجھے دھتکارتی ہو ۔۔۔ اور یہ سن کر طلعت نے اپنے سر کو زور
سے جھٹکا دیا۔ "میں نے کب کہا تھا کہ تم میرا سر دباؤ بس آگئی اوپر سے
احسان کرنے۔ جاؤ بھائی جان کا سر دباؤ۔ وہی تم کو ٹافی کھلاتے ہیں۔
چوڑیاں لاکر دیتے ہیں۔ میں کہاں سے ٹافی لاکر دوں گی"

اور طلعت کا یہ طعنہ وہ سمجھ گئی۔ جس ماحول میں وہ رہتی تھی وہاں طعنہ آئے دن کی بات تھی۔ صبح سے اسی قسم کی باتیں ہوتی رہتی تھیں مگر وہ اور باتوں کی طرح اس کی بھی پروانہ کرتی۔ اگر بھائی جان کا نام بیچ میں نہ آجاتا۔

"تمھیں طلعت باجی نہ جانے بھائی جان سے کیوں چڑ ہے۔ تم بھی کہہ دو لادیں گے چوڑیاں، رہ گئی ٹانی کی بات، تو اب ٹانی ہی ٹانی کھانا آخر بھائی جان کا کام کرو گی آپ کھلائیں گے ٹانی۔ نہیں تو میں آپ کہہ دوں گی"؟ وہ کھسیانی ہو کر بول رہی تھی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ رات آنکھ جھپکتے گذر گئی، دن نکلا اور ریشماں حسب دستور اپنے کام میں لگ گئی اس کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ کیاریوں میں پانی دے رہی تھی کہ بھائی جان نے آواز دی۔ بس وہ بالٹی چھوڑ چھاڑ پہنچ گئی ان کے کمرے میں — "کیا ہے بھائی جان"

"ارے بھئی ریشم، کالج کا وقت ہو گیا ہے اور ابھی تک کھانا ندارد اس طرح میرا خیال رکھو گی۔ اچھا جاؤ ٹانی نہ دوں گا۔" نسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی لائی بھائی جان۔ آپ ہاتھ دھوئیے" اور وہ سب کچھ بھول گئی ادھر نسیم نے ہاتھ بھی نہ دھوئے تھے کہ وہ کھانا لے کر پہنچ گئی اور میز پر لگا کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرانے لگی۔ "کہئے بھائی جان اور کچھ" اس نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

"بس ریشماں تم ہو تو سب کچھ ہے" نسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہاں میں تو ہوں۔ مگر یہ تو بتایئے کہ اور کچھ بھی چاہیئے" اور یہ کہہ کر یہ جا وہ جا۔ خوشی کے مارے اس کا برا حال تھا اور وہ جلدی جلدی پانی نکال رہی تھی۔ اور اس کے خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس قدر خوش کیوں ہے اور ابھی وہ پانی ہی نکال رہی تھی کہ اس کی نظر طلعت پر پڑی جو بڑے اطمینان سے انگڑائی لیتی ہوئی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہی ریشماں کو کچھ یاد آگیا۔ اور اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی سلوٹ پڑ گئی ـــــــــــــــــــــ "طلعت باجی! ـــ لو یہ پانی بھائی جان کو دے آؤ۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ یا پھر میرے ساتھ چلو میں رکھ آؤں گی" اور طلعت کو ہنسی آگئی۔ لیکن ریشماں کے چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی بھی آثار نہ تھے۔ وہ اسی طرح خوش تھی اور آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔
"اچھا جا رکھ آ" طلعت نے ہنستے ہوئے کہا۔ اتنا سننا تھا کہ اس کے جسم میں پھر بجلی سی دوڑ گئی اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ گلاس لے کر نسیم کے کمرے میں پہنچ گئی ـــ "بس اب اور کچھ نہیں"۔ انھوں نے ٹانی نکال کر سامنے رکھ دی "لو یہ کھالو۔ شاباش۔ بڑے کام کی ہے اپنی ریشم"
اور ریشماں نے بڑی مرجھائی ہوئی شکل بناتے ہوئے کہا: "میں نہیں لیتی۔ دیجیے گا طلعت باجی کو"۔

"کیوں طلعت کو کیوں؟" نسیم نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

"جلتی ہیں جو —" وہ کچھ سمجھ کر چپ ہو گیا۔ اور ریشماں نے سر جھکا کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "نہ جانے انھیں یہ میرا ٹانی کھانا کیوں بُرا لگتا ہے وہ بھی کبھار وز روز کھاتی ہوں۔ اب انھیں کھلا دیا کیجئے۔ میں تمہیں کھاؤں گی۔ اب وہی آپ کا کام کریں گی۔" ریشماں کو سچ مچ غصہ آنے لگا تھا۔ اسے کل کی بھولی بسری بات یاد آ گئی تھی۔

"اچھا خیر — لو یہ کھا لو — میرے کہنے سے پھر دیکھا جائے گا" — اس نے مسکرا کر ٹانی منہ میں ڈال لی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"مت بتانا طلعت کو —"

"اچھی بات ہے" اس نے کچھ سوچ کر کہا اور پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ طلعت سے ہر بات نہ بتانی چاہیئے۔ اور اس نے ٹانی کو منہ میں کچھ اس طرح رکھ لیا جیسے کوئی راز منہ میں بند کر لیا ہو اور تھوڑی دیر کے لئے تو غیر ارادی طور پر اس نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ نسیم سے بھی کوئی راز رکھے ہوئے ہو۔ اس نے ٹانی کو اور زور سے ہونٹوں میں بھینچ لیا۔ اور ایکبار اچھل کر وہی ریشماں ہو گئی — ادھر بیگم نے جو اسے نسیم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو انھیں جیسے کچھ یاد آ گیا۔ انھوں نے آہستہ سے کہا۔ اری ریشماں! تجھ سے کیا کہا تھا کہ مت جایا کر نسیم کے کمرے میں اور تو اچھل کر پہنچ

جاتی ہے، ذرا بھی تجھے ہوش نہیں؟

"ارے بھابی بس کھانا ہی تو دینے گئی تھی، طلعت باجی اپنے کمرے میں تھیں، بھائی جان کو کالج جانے میں دیر ہو رہی تھی، انھوں نے مجھے آواز دی اور میں چلی گئی — اور ہاں جو پانی کے لئے طلعت باجی سے کہا تو انھوں نے کہہ دیا کہ جا تو ہی دے آ — اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔"

ریشماں کافی سے زیادہ زور سے بول رہی تھی۔ چنانچہ بیگم بھی ایک طرف خاموش ہو کر چل دیں۔ یہ سوچتی ہوئی — ابھی ناداں ہے۔ ذرا بڑی ہوگی تو خود ہی یہ حرکتیں چھوڑ دے گی۔ سن کا تقاضہ ہے —

مگر جب نسیم نے اپنی شادی کی بات پر صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کہیں شادی نہ کرے گا اور اگر کرے گا تو اسی سے پالک لڑکی سے جس کا نام ریشماں ہے۔ تو جیسے سارے گھر کی انسان دوستی دھل کر صاف ہو گئی۔ وہ اپنی ریشماں جس کا تھوڑی دیر پہلے کون رکھا تھا۔ جو بیچاری تھی۔ اب ایک دم پوری حرافہ ہو گئی۔ جس نے سیدھے سادے نسیم پر کوئی جادو کر دیا تھا — اور بیگم یہی کہتی رہیں کہ ان کا نسیم تو بالکل معصوم ہے، اس پر اسی چھوکری نے کچھ کر دیا ہے — اور پھر کوئی شکل صورت ہو تو بات بھی ہے کہ چلو لڑکے کا ایک پری پر جی آ گیا مگر وہ تو بھتنی ہے بھتنی — رنگ گورا ہے تو کیا جیسے کوڑھ کے داغ، آنکھیں بڑی بڑی کالی کالی۔ جنھیں دیکھ کر دور ہی سے ڈر

لگے۔ کون اس کو خوبصورت کہے گا۔ جسم پر کچی کچی کھال جیسے کسی نے مڑھ کر ابھی رکھ دیا ہو اور تیل کی مالش سے خوب چمکا دیا ہو، کوئی صورت میں صورت ہے، کسی طرح برداشت کر بھی لیتے مگر وہ تو لے پالک تھی، ہڈی کا داغ کہیں چھوٹ سکتا ہے۔ اب اس سے بیاہ کر کے کون اپنی ہڈی میں بل ڈالے۔ کوئی لڑکا اور ہو تو یہ بھی کچھ تسلی ہو کہ چلو خاندان تو چلے گا۔

اور بیگم نے بھی طے کر لیا کہ چاہے کچھ ہو اپنے اکلوتے کی شادی وہ پالک سے نہیں کریں گی ــــ دو چار روز میں کونے اترے، سارے گھر میں یہی باتیں ہونے لگیں، ریشماں بھی اسی گھر میں رہتی تی، اس سے کوئی کہاں چھپاتا۔ اس نے بھی اڑتی اڑتی سن ہی لی کہ معاملہ کیا ہے ــــ "ہائے اللہ" اس کا دماغ سُن سے رہ گیا آخر یہ معاملہ ہے کیا۔ بھائی جان کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا۔ لیکن پھر اس کو جیسے کوئی سکون مل گیا ــــ اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نسیم نے اسے آواز دی۔

"اری ریشم ذرا ادھر تو سن" آواز سنتے ہی جیسے اس کے سارے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا جیسے کوئی ہرن شکاری کی چاپ سے اپنے کان کھڑے کر لے۔ مگر اس کو آواز پہچاننے کے لئے اپنے کان کھڑے کرنے کی تھوڑا ہی ضرورت تھی۔ وہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کوئی

دکھائی نہ دیا، اس نے آہستہ سے قدم اٹھایا، فرش پر رکھا چھن سے آواز
آئی ــــ کیسی آواز، اس کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا، پھر اس نے دوسرا پاؤں
اٹھایا اور بہت آہستہ سے فرش پر رکھا مگر فرش تو جیسے چینی کا ہو گیا تھا
اس نے گھبرا کر پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے سارے
گھر کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں ــــ اور سب چھپ چھپ کر دروازوں
کی اوٹ میں سے جھانک رہے تھے۔ جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں
ڈال دی تھیں، وہ آہستہ آہستہ نسیم کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

"کیسا ہے بھاتی ــــ جان" اس سے بھائی جان بھی تو ٹھیک سے
نہیں کہا گیا۔

"اری ریشماں ــــ کیا بات ہے تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے"
مگر وہ کیا بتاتی ــــ اس کو تو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں گھبرائی
ہوئی تھی۔

"کوئی بات بھی بتاتے ہو یا جاؤں؟"

"ارے آج کیا ہو گیا ہے ریشم بی؟"

"تم کام بتلاتے ہو یا پھر جاؤں ــــ بھابی اور طلعت باجی نہ جانے
کیا۔۔۔"

"بھابی اور طلعت باجی ــــ کیا بات ہوئی؟"

"کچھ بھی تو نہیں ــــ اچھا میں جاتی ہوں" اور یہ کہہ کر وہ مڑی ہی تھی کہ نسیم نے روک لیا۔

"اچھا لو ــــ یہ ٹافی تو کھا لو" ــــ نہیں ــــ میں نہیں لیتی یہ ٹافی کوئی دیکھ لے گا۔"

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا کرے گا، کوئی کسی کی چوری ہے۔ تجھے آج ہو کیا گیا ہے ریشماں؟"

"اونہہ" ریشماں نے بھویں سکوڑتے ہوئے کہا، پھر کچھ ایسی شکل بنائی جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہی ہو۔ "بھائی جان آپ بھی بڑے بے وقوف ہیں جو اتنی سی بات نہیں سمجھتے" مگر پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ ٹافی لی اور کمرے سے باہر نکل گئی اور اتفاق کی بات بیگم دوسرے کمرے سے نکل رہی تھیں، انھوں نے جو ریشماں کو نسیم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو ٹھٹھک گئیں ــــ "اری ریشماں کی بچی کیا کر رہی تھی کمرے میں" اور ریشماں کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ــــ وہ تو وہیں بس جم کر رہ گئی ــــ اس نے ٹافی کو خوب اچھی طرح مٹھی میں بھینچ لیا اور اس کی زبان سے تو جیسے کوئی لفظ ہی نہیں نکل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

"جھاڑو دینے گئی تھی کمرے میں" ــــ "ایسے دی جاتی ہے جھاڑو ــــ بات منہ صاف، دھول کا نشان نہیں ۔۔ پھر فرش پر جھاڑو بھی سنائی

نہ دے۔ ایسے دیتا ہوگا کوئی بھاڑ و ۔۔۔ دیکھو ریشیاں میں صاف صاف کہے
دے رہی ہوں اگر تم کو اس گھر میں رہنا ہے تو عزّت کے ساتھ رہو یہ سب
چھل فریب نہیں چلیں گے جس ہانڈی میں کھانا اسی میں چھید کرنا۔ ڈائن بھی
دس گھر چھوڑ کر کھاتی ہے ۔۔۔ تجھے تو نام کو بھی شرم اور لاج نہیں ۔
اچھے بھلے لڑکے کو خراب کر کے رکھ دیا ہے اس حرّافہ نے ۔۔۔ اور تیرا
بھی کیا، غلطی میری تھی جو میں نے پاؤں کی جوتی کو پاؤں میں نہیں
رکھا۔ ورنہ تیری مجال تھی جو آنکھ اٹھا کر دیکھتی میرے لال کی
طرف ۔۔ بھول گئی اپنی اوقات ۔۔۔' بیگم کا غصّہ اور بڑھتا اگر طلعت
اس کو ہٹا کر ایک طرف نہ لے جاتی ۔

لیکن ریشماں سر جھکائے اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کے ہاتھ
کی گرفت سے ٹافی چھوٹ گئی ۔۔۔ وہ بے خیالی میں اسے اپنے پاؤں
سے روندنے لگی اور ساتھ ہی انتظار کرتی رہی کہ کوئی اس کی طرف سے
بھی بولے گا مگر کوئی آواز نہیں سنائی دی وہ یہ سوچتی ہی رہ گئی کہ اب
بھائی جان ضرور بولیں گے ۔۔۔ اس کی طرف سے وہ لڑیں گے۔ اور
جلدی سے کمرے سے نکل کر ایک ٹافی اس کے منہ میں ٹھونس دیں گے
۔۔۔ اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
کہیں گے۔

"ناری ریشماں! تو مت گھبرا، میں جو موجود ہوں — تجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت — میں نے تو طے کر لیا ہے کہ تجھ سے شادی کروں گا چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔"

مگر بھائی جان نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ البتہ اس وقت اس کے ذہن میں تیزی کے ساتھ آیا کہ وہ ڈائن ہے — حرافہ ہے — پاؤں کی جوتی ہے — بے پالک ہے — ہاں ہاں بے پالک —!

اسکول ماسٹر

نسرین کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ اس کی شفق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو گئی اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کالی رات نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا اور یہی نہیں بلکہ آکاش کے ان گنت تاروں نے بھی اپنی آنکھیں موندلیں اور اندھیرے کے اس اتھاہ سمندر میں جو اس کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے تھا ایک گہری سیاہی کسی عفریت کی شکل میں آکر ڈرا رہی تھی۔ وہ اس سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتی جاتی تھی مگر سیاہی میں عفریت اور زیادہ خوفناک ہوتا جاتا تھا اور نسرین کی اپنی شادی جو در اصل شام کی لالی تھی ایک واہمہ سا معلوم ہوئی۔ اس کا سر جھک گیا، اس کے شریکِ حیات کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ دھڑ دھڑ جل رہا تھا اور نسرین اسے بجھا نہ سکتی تھی اور اسکول ماسٹر

کھانستا تھا اور دیر تک اسی طرح کھانستا رہتا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے سینے میں جو گھن لگا ہوا تھا وہ اس کے اس طرح کھانسنے سے گرتا جاتا ہو اور پھر کھال اور ہڈیوں کا یہ خول! اس کے تصور سے ہی اس نے اپنے جسم میں کپکپی محسوس کی۔ وہ تیزی سے بے تکان کھانستا اور نسرین کے جسم کے تمام تار اس آواز سے جھنجھنا جاتے اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کسے اس کے سینے میں ہوک اٹھتی تھی اور وہ کانپ جاتی تھی۔ بارہا اس کو غصہ بھی آتا تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار اس کو ڈانٹ کر کہہ دے کہ اس طرح مت کھانسا کرو پھر اس کو اپنے اوپر ہی یہ غصہ اتارنا پڑتا اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ کھانسی کیوں اٹھتی ہے۔ بارہا اس نے اپنے آپ کو بہلایا مگر بھلا خود کو کس طرح فریب دے سکتی تھی اور پھر یہ تو ابتدا تھی لیکن اس حال کو دیکھ کر وہ گھبرا جاتی تھی، کیونکہ اسی حال کی کوکھ میں ایک ایسے مستقبل کی پرورش ہو رہی تھی جس کے تصور ہی نے اس کو نیم پاگل کر دیا تھا۔

اور آج بھی جب اسکول ماسٹر گھر میں داخل ہوا تو حسب معمول اس کے چہرے پر تھکن سی تھی اور یہ تھکن کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب بھی شام کے وقت وہ اسکول سے واپس آتا اس کا سر لٹکا ہوتا۔ اور اس کا ہی نہیں مغرب کی طرف سورج بھی اپنا سر جھکائے ہوتا اور برابر مغرب کی

اندھیری گھاٹیوں میں گرتا چلا جاتا —— یوں تو وہ تاریخ کا استاد تھا۔ بچوں کو تاریخ پڑھایا کرتا تھا۔ سن رٹایا کرتا تھا، جنگوں کی یادیں دلایا کرتا تھا اور بار بار کہا کرتا تھا —— بچو! یاد رکھو یہ لڑائی بہت اہم ہے۔ یہ ضرور یاد رکھنا —— پتھر کے زمانے سے لے کر ایٹم کے زمانے تک کی جنگیں یاد دلاتا —— باوجودیکہ وہ تاریخ کا استاد تھا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ آخر اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے —— تاریخ کا فرض ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد انسانی عظمت کا احساس پیدا ہو —— لیکن یہاں تو تاریخ کے ارتقا کا اعتماد بھی کمزور ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے تاریخ کو نئے ڈھنگ سے پڑھانا شروع کر دیا تھا —— وہ خوب محنت کر کے پڑھاتا تھا مگر اس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ یہ اتنی روپے جو بطور معاوضہ اسے ملتے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ اس سے اس کے گھر کا گذارا نہیں ہوتا اور اسے یہ بھی نہ معلوم تھا کہ کس طرح اس حقیر سی رقم میں نسرین گھر کا تمام خرچ پورا کرتی ہے —— اور جب کبھی وہ شکایت بھی کرتی تو اسکول ماسٹر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی اس لئے کہ وہ اسکول ماسٹر تھا اور اسکول ماسٹر کو قناعت کرنی چاہیئے۔ اس کا پیشہ متبرک اور مقدس ہے اور اس کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لئے اُسے اس قسم کی باتوں سے اپنے دماغ کو نہ الجھانا چاہیئے۔

"نسرین تم جانتی ہو، میں اسکول ماسٹر ہوں —— میں بچوں کو

علم دیتا ہوں۔ میں اسے سونے اور چاندی سے نہیں تولنا چاہتا۔ میں بھوکا مر جاؤں گا مگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے شاگرد علم سے محروم رہیں"۔

"مگر میں کیا کروں اسی روپے میں گھر کا خرچ نہیں چلتا ۔۔۔۔" وہ اپنے کپڑوں کے پیوند دیکھ کر سر جھکا لیتی، اور جب وہ نظر اٹھاتی تو اسکول ماسٹر کے بوسیدہ کپڑوں پر بھی اس کی نظر پڑتی ۔۔ پھر اس کی پلکیں بھیگنے لگیں ۔۔۔ مگر اسکول ماسٹر حد درجہ بے حس تھا۔ وہ اس کے آنسو اس طرح پونچھ دیتا جیسے کوئی آئینے پر پڑی ہوئی دھول کو اپنے رومال سے صاف کرے۔ اور دوسرے لمحے اپنے رومال کو جھٹک ڈالے اور پھر اس کو یہ بھی خیال نہ ہو کہ آئینے پر دھول جم گئی تھی۔

"نسرین ان کپڑوں کو مت دیکھو اس علم کو دیکھو جو میرے سینے میں ہے اور جو ہر دم نکلنے کے لئے بے قرار رہتا ہے"!

اور نسرین کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے اس لئے کہ جب اسکول ماسٹر کو اپنی ہی فکر نہ تھی تو پھر اور کس کی ہوتی ۔۔۔ بیماری سے اس کا یہ حال تھا کہ گال اندر کو دھنس گئے تھے۔ آنکھیں روز بروز بیٹھتی جاتی تھیں اور پھر وہ کھانسی جو رہ رہ کر اٹھتی تھی لیکن وہ اس کھانسی کی کب پرواہ کرتا تھا ۔۔۔

وہ بڑی خوشامد سے کہتی "اپنی کھانسی کا علاج کرو"۔ مگر وہ حسب معمول

سنی ان سنی کر دیتا اور پھر جب وہ زور دے کر کہتی تو وہ بڑے اطمینان سے کہتا ــــ

"ارے کھانسی ہی تو ہے چلی جائے گی" وہ جھنجھلا کر رہ جاتی اور آج جب اسکول ماسٹر کھانستا ہوا گھر میں داخل ہوا تو نسرین کو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ کھانسی اس کے سینے پر آکر دھکے دے رہی ہے اور اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ کھانستا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آج بہت تھک گیا ہوں نسو ــــ آج اشوک پڑھانا تھا اور تم جانتی ہو اشوک مجھے بے حد پسند ہے، اس کے زمانے میں کبھی جنگ نہیں ہوئی ہاں کلنگ کی جنگ کے بعد ــــ تمھیں تو یاد ہو گی، اس کے بعد اس نے جنگ کرنی چھوڑ دی کشت و خون سے گھبرا کر اس نے عہد کر لیا کہ جنگ نہیں ہو گی اب امن رہے گا اور تمام عمر اشوک نے امن کی حفاظت کی، انسانی خون بہنے نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ آج تاریخ کے آسمان پر اشوک کا نام ستارے کی طرح چمکتا ہے، کاش آج بھی دنیا اشوک کی عظمت کو محسوس کر سکتی۔ اور پھر کھانسی کا دورہ اٹھنے لگا۔ اس کے گلے میں پھندا سا پڑنے لگا اور تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر وہی کھانسی شروع ہو گئی تھی جو اس کے سینے میں غبارے کی طرح پھولتی تھی اور پھر ایک پر ہول آواز!! ــــ

جیسے اس کے سینے میں غبارا ــــ پھول پھول کر پھٹ رہا ہو ــــ اس نے اسکول

ماسٹر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"تم لیٹ جاؤ، خاموشی سے تھوڑی دیر، آرام کرلو۔ یہ کیا کہ آئے اور پڑھانا شروع کر دیا" اور نسرین نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔

اسکول ماسٹر خاموشی سے لیٹ گیا گو بظاہر وہ خاموش تھا لیکن وہ باتیں کر رہا تھا اشوک کی عظمت کو محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ آج بھی بچوں کو نئے ڈھنگ سے تاریخ پڑھا سکتا ہے مگر اس نصاب کا کیا ہوگا جو اس کو جیل کی چہار دیواری کی طرح چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور وہ نصاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ تاریخ انسانوں کو نفرت سکھاتی ہے۔ جب تک جنگیں پڑھائی جائیں گی اور جب تک جنگیں سکھائی جائیں گی ہم ایک دوسرے سے نفرت کریں گے — مگر جنگ سے تو در اصل کوئی فرار بھی نہیں ہے — اور وہ اپنے نظریئے کے مختلف دھارے پر بہنے لگا۔ وہ جنگ نہیں چاہتا کسی شکل میں نہیں چاہتا — مگر یہ پچھلی جنگیں در اصل عام طور پر صاحب اقتدار طبقوں کے مابین ہوتی رہی ہیں — اور اسی صاحب اقتدار طبقہ کے خلاف عوام کے دل میں ایک آگ سلگ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا — کھانسی رُک گئی تھی۔ وہ نیم مردہ حالت میں پڑا تھا لیکن اس کا دماغ بدستور کام کر رہا تھا۔ تاریخ .... ہمیشہ ارتقا کی جانب قدم بڑھایا ہے اور آج بھی بڑھ رہی ہے مگر جنگ کی منحوس قوتیں اسے روکنا چاہتی ہیں۔ لیکن امن کی قوتیں بھی تو مضبوط

ہیں اس لئے کہ عوام کا ایک کثیر طبقہ اس کے ساتھ ہے جو جنگ کے ان درندوں
کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اسکول ماسٹر ماحول سے بے نیاز ہو گیا ــــ
"بچو! امن کی طاقتیں مضبوط ہیں اس لئے کہ تم مستقبل ہو، تم امن
کے ساتھ ہو، ہم امن چاہتے ہیں ــــ ہم اشوک کے دیش میں پیدا ہوئے ہیں۔"
"ارے یہ اسکول کا کمرہ نہیں ہے۔" نسرین نے ہنستے ہوئے کہا اور
اسکول ماسٹر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے دماغ کو ایک جھٹکا دیا
اور نسرین سے باتیں کرنے لگا۔

یہ تھی اسکول ماسٹر کی زندگی! وہ ایک عجیب و غریب ذہنی ماحول میں
رہتا تھا۔ اس کی دنیا الگ تھی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا اور نسرین اس کی
کمزوری کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان تمام کمزوریوں کے باوجود
اسکول ماسٹر ایک عظیم المرتبت انسان ہے لیکن اگر اس کی بیماری بڑھتی جا
رہی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا اسی لئے کہ اس کی بیماری کا علاج کسی سینی ٹوریم
میں تھا۔ جس کا ماہانہ خرچ تین سو روپیہ تھا۔ وہ وہاں نہ جا سکتا تھا تو اس میں
اس کا کیا قصور تھا اس لئے کہ اس کی تنخواہ تو صرف اسی روپے تھی اور اگر اس
کی تنخواہ اتنی کم تھی تو اس میں بھی اس کا کیا قصور تھا ــــ

اور جب وہ کہتی ــــ

"تم کو یہ نوکری چھوڑ دینی چاہیئے ــــ اسی روپے میں کہیں کام چلتا ہے۔"

"نسو میری زندگی میں یہ اسی روپئے اہمیت نہیں رکھتے بلکہ وہ بچے جن کی
بھوکی نظریں میری طرف منہ کھولے دیکھتی رہتی ہیں بالکل ان چڑیا کے بچوں
کی طرح جو چونچ کھولے رہتے ہیں کہ چڑیا ان کے منہ میں دانہ ڈالے ـــ میں
ان بچوں کو علم کی غذا فراہم کرتا ہوں ۔ میں ان مادّی چیزوں سے ماورا کچھ اور
دیکھتا ہوں ـــ تاریخ بڑا پیچیدہ موضوع ہے اگر میں نے اسکول چھوڑ دیا تو
یہ تاریخ کے راستے سے بھٹک جائیں گے اور مستقبل میری ہڈیوں سے جواب
طلب کرے گا ـــ تم نہیں سمجھتیں نسرین ، گذر کرو، تکلیف اٹھاؤ کسی طرح ـ
دراصل علم اور عقل نانِ جویں سے بہت بلند ہیں"

"اچھا تو اپنی تنخواہ بڑھانے کے لئے کہو ـــ آخر اس گرانی میں کیسے
کام چلے گا ـ پھر تمہاری یہ حالت تمھیں اپنا علاج کرنا چاہیئے ـــ"

"تنخواہ بڑھانے کے لئے !" اسکول ماسٹر جیسے سوتے سے چونک پڑا
ـــ نہ جانے یہ روز روز وہی باتیں کیوں کرتی ہے ، جبکہ اسے معلوم ہے کہ
ملک کتنی مصیبت سے گذر رہا ہے ـ بڑے بڑے سیاسی رہنما عوام سے
اپیل کر رہے ہیں کہ وہ کم سے کم روپے میں گذر کریں ایسی صورت میں یہ کیونکر
ممکن ہے کہ وہ تنخواہ بڑھانے کے لئے زور دے ـ اور پھر صرف کہنا ہی کافی
نہیں ہے اس کے لئے ہڑتالیں کرنی پڑتی ہیں اور ہڑتال کرنا ـــ وہ اسکول
ماسٹر ہے کارخانہ کا مزدور نہیں ہے ـ اس کو بڑے بڑے لیڈروں کی تقریریں

زبانی یاد تھیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے متبرک پیشہ کو چند سکوں کے لئے ہڑتال کر کے ذلیل کرے ـــ وہ اسّی روپے میں گذر کرے گا۔

اسکول ماسٹر ماحول سے بے نیاز ہو کر پڑھا رہا تھا اگر اس کو کسی چیز کا احساس تھا تو صرف اتنا کہ اس کے بچّے اس کے سامنے بیٹھے ہیں اور علم حاصل کرنے کے لئے ان کے دماغ اس طرح کھُلے ہوئے ہیں جیسے چڑیا کا بچہ ایک دانے کے لئے چونچ کھولے رہتا ہے کہ چڑیا اُس کے منہ میں دانہ ڈال دے اور اسکول ماسٹر ان کے دماغ میں دانہ ڈال رہا تھا اس لئے کہ یہ دانا ان کے دماغ میں پرورش پائے اور ایک بڑے پیڑ کی شکل میں پروان چڑھے ـــ وہ برابر پڑھاتا جا رہا تھا اگر اس کے کمرے میں انسپکٹر داخل ہوا تو کیا ہوا اس سے اسکول ماسٹر کے پڑھانے میں کیا فرق پڑتا اس کو وہ بچّے بدستور نظر آرہے تھے اور تاریخ کا ماضی اس کے سامنے کھلا پڑا تھا ایک وسیع و بے پایاں سمندر اس کو نظر آرہا تھا جس کے کنارے کھڑے ہو کر وہ موتی چُن رہا تھا اور انسپکٹر رپورٹ لکھ رہا تھا۔ اگرچہ انسپکٹر نے اپنی کاپی میں یہ لکھ لیا تھا کہ اسکول ماسٹر کے کوٹ پر بے شمار پیوند ہیں اور یہ پیوند اس کی شخصیت کو طلبا کی نظروں میں کم تر کرتے ہیں، اسکول ماسٹر کو ایسے کپڑے پہننے چاہئیں جس سے اس کے شاگردوں پر رعب پڑے۔ وہ اس کا احترام کریں ـــ لیکن اس کے ایسا لکھ دینے سے اسکول ماسٹر کی شخصیت پر کیا

اثر پڑتا ہے ــــ اور اسی لئے وہ بے خبری کے عالم میں پڑھا رہا تھا۔ اشوک کی عظمت کا احساس دلا رہا تھا۔ ماضی کے اس عہد زریں کو دہرا رہا تھا جس کی بنیادوں پر نئی تعمیریں کرنی ہیں ــــ وہ بتا رہا تھا کہ اشوک کے کتبے نے دربار اور عوام میں ایک ربط پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ــــ عوام کا مفاد حکومت اور ریاست کا مفاد ہے ــــ اور بدلتے وقت نے ان روایات کو بطور سنگِ بنیاد رکھا ہے۔ لیکن یہ سنگِ بنیاد آج کی عمارت نہیں ہو سکتی اس کو سنگِ بنیاد کی شکل میں زمین کے سینے ہی میں رہنا ہو گا اور ہم اس پر نئی عمارت اٹھائیں گے ــــ نئی عمارت۔ جس کے مالک عوام ہوں گے۔

اسکول ماسٹر اصل ماحول سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اسی لئے جب اسے معلوم ہوا کہ اسکول کے انسپکٹر نے اس کی تعلیم پر اعتراض کیا ہے تو وہ سمجھ گیا کہ جب وہ تاریخ کے کھنڈروں میں کھویا ہوا تھا تو انسپکٹر نے آکر اسے دیکھ لیا تھا اور انسپکٹر کی رپورٹ کہہ رہی تھی کہ اسکول ماسٹر بچوں کو سیاست کی تعلیم دیتا ہے، وہ تاریخ کے ماضی پر روشنی ڈالنے کے بجائے حال اور مستقبل پر اپنی کمندیں ڈالتا ہے ــــ تاریخ کا جوڑ سیاست سے ملاتا ہے تو وہ چونک پڑا ــــ اس نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ ان پر جگہ جگہ پیوند تھے اور ان کی تراش خراش بھی وقت کی مناسبت سے دور تھی اور آج جب پہلی مرتبہ اس نے انسپکٹر کی رپورٹ کے مطابق اپنے کپڑوں کو دیکھا

— تو اس کو اپنے ان کپڑوں سے شرمندگی محسوس ہوئی — نسرین ٹھیک کہتی تھی کہ اس کے کپڑے اسکول ماسٹر کے شایانِ شان نہیں ہیں اور اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی نسرین پھر گئی۔ جو خود اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور اُسے یاد آیا —

"نسرین میں تمہارے حسن کو ظاہری آرائش سے قطع نظر کر کے دیکھتا ہوں — حسن کی محض ہنگامی قدریں نہیں ہوتیں — وہ ابدی ہوتا ہے ——— وہ ماحول کا عکس بھی پیش کرتا ہے اور ماحول میں اپنا عکس بھی ڈھونڈتا ہے — حسن حس ہوتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ وہ محبت بھی ہوتا ہے اور محبت خدا ہے اور خدا محبت ہے — اس لئے کیا حُسن خدا نہیں ہوسکتا۔ اگر حُسن خدا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے ماحول اور اس سے متعلق کر کے اسے ہنگامی قدروں کے معیار پر پرکھیں — میری نسرین تم حُسن ہو" اور اس نے دیکھا کہ نسرین تھوڑی دیر کے لئے اپنے ان کپڑوں کو بھول گئی۔ اپنی اس غذا کو بھول گئی جو بمشکل تمام اسے میسر ہوتی تھی، اپنے اس مکان کو بھول گئی جو موسموں کے مقابلے میں شکست تسلیم کر چکا تھا لیکن اس وقت غریب اسکول ماسٹر کی بیوی ایک شہزادی ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی، پاک، صاف اور شفاف — اور اس وقت اسکول ماسٹر کو حس کی ابدیت پر اور زیادہ پختہ اعتماد ہو گیا تھا۔ اس کو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اس کے کپڑے

ماہ وسال کی گرد میں اَٹے ہوئے تھے — لیکن اب جبکہ اسکول کے انسپکٹر نے اس کے کپڑوں پر روشنی ڈالی تھی تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ آسمان کی رفعتوں پر پرواز کر رہا تھا کہ اچانک اس کے بازوؤں نے جواب دے دیا اور وہ بے بس ہو کر زمین پر آ رہا — اس کی بیوی حسین تھی تو کیا، اس کے کپڑے تو بوسیدہ تھے — اس کے نرم و نازک جسم پر موٹے کپڑے کس قدر بھدّے معلوم ہوتے تھے۔ اسکول ماسٹر کا دماغ علم و عقل کا خزینہ تھا تو کیا ہوا، اس کے جسم میں تو گھن لگا ہوا تھا، اس کے کپڑوں پر پیوند لگے تھے — حسن محبت ہے اور محبت خدا ہے — یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ حسن مادہ ہے اور مادہ ماحول کی پیداوار ہے — اس لئے حسن کس طرح ماحول سے الگ رہ سکتا ہے — وہ چونک پڑا۔

اسکول ماسٹر کو ماحول کا پورا پورا احساس تھا۔ جب اس نے اپنی تنخواہ بڑھنے کے لئے کہا تھا، جب اس نے اپنی ہی نہیں بلکہ دوسرے ماسٹروں کی تنخواہ کے اضافہ کے لئے بھی مشترکہ طور پر درخواست دی اور اس کو اس کا اور شدّت سے احساس ہوا جب اس کی درخواست ٹھکرا دی گئی اور ان سب ماسٹروں سے کہہ دیا گیا کہ انھیں اسی تنخواہ پر کام کرنا ہوگا۔

اور نسرین نے کہہ دیا کہ وہ اس تنخواہ پر اسکول ماسٹر کو کام کرنے نہ دے گی۔

اور ہیڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ اسکول ماسٹر کے نہ صرف جسم ہی میں گھن لگا
ہے بلکہ اس کا دماغ بھی بیکار ہو چکا ہے۔ اور اس نے دوسرے ماسٹروں
کو بلا کر کہہ بھی دیا۔

"تم لوگ اپنا کام جاری رکھو اس مدقوق اسکول ماسٹر کے چکر میں
مت آؤ اس لئے کہ وہ چند روز کا مہمان ہے اور تم کو دنیا میں رہنا ہے
۔۔ اپنے بال بچوں کی پرورش کرنی ہے۔"

اور یہی نہیں اُس نے مدقوق اسکول ماسٹر سے بھی کہہ دیا:

"میں جانتا ہوں کہ یہ سب تمہاری شرارت ہے۔ اگر اب بھی راہ راست
پر نہ آئے تو میں بلائے لیتا ہوں کسی دوسرے کو ۔۔ کیوں اپنے رزق کے
پیچھے پڑے ہو۔"

لیکن اسکول ماسٹر بچہ نہیں تھا جو ہیڈ ماسٹر کی باتوں سے خوفزدہ
ہو جاتا۔ اس کے جواب میں وہ مسکرایا اور اُس کی مُسکراہٹ میں وہ تمام
زہر خند چھپا ہوا تھا جس نے اس کے ماتھے پر دو تین تیوریاں ڈال دی تھیں۔

اور پھر ہڑتال شروع ہو گئی۔ اسکول ماسٹروں کی ہڑتال ۔۔ سفید
کپڑے پہننے والے مہذب مزدوروں کی ہڑتال ۔۔ اور اس ہڑتال کو چار
روز ہو گئے ۔۔ چوتھے روز بڑے وزیر نے شہر کے ایک جلسے میں تقریر کی
۔۔ وہ جلسہ جس میں اسکول ماسٹر بھی موجود تھا، اس کی اپنی نسریں بھی موجود

تھی جس کے آنسو وہ اسی طرح پونچھ دیا کرتا تھا جیسے کوئی آئینے پر پڑی ہوئی دھول کو اپنے رومال سے صاف کر دیتا ہے اور پھر دوسرے لمحے اپنے رومال کو جھٹک دیتا ہے۔

اور بڑا وزیر — وزیر اعظم چیخ رہا تھا اور اس کی آواز میں گیہوں اور چاول کی قوت شامل تھی اور اس کا سُرخ و سپید چہرا اور بھی لال ہو رہا تھا۔ مجمع خاموش تھا، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے میں اس کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

"بڑے شرم کی بات ہے آپ کے شہر میں ماسٹر تنخواہ کے لیے ہڑتال کر رہے ہیں، مِل کے مزدوروں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، چند پیسوں کے لئے بچوں کو علم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں، ہم ہندوستانی ہیں اور ہمیں اپنی روایات کا احترام کرنا چاہیئے — کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ کے دیش میں رشی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، چنے چبا کر پڑھایا کرتے تھے سادہ زندگی گذارتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا علم اُبلتے ہوئے چشمے کی مانند صاف و شفّاف ہوتا تھا۔" — اور اسکول ماسٹر محویت کے عالم میں سنتا رہا — اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ بڑے وزیر کی تقریر کب ختم ہوئی — اور کب وہ کار میں بیٹھا — ہاں اُس نے اس کی کار کو سناٹے سے بھاگتے ہوئے دیکھا — کار بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور مجمع

دیکھتا رہ گیا۔ اور نہ جانے کیوں اسکول ماسٹر کو خیال آیا کہ سانپ چلا گیا ہے اور سارا مجمع لکیر پیٹ رہا ہے۔

جیل کی چہار دیواری میں بیٹھا ہوا اسکول ماسٹر سوچ رہا تھا کہ اس کا جرم کیا ہے؟ — کیا صرف اتنا کہہ دینا جرم ہے کہ ہم بھوکے ہیں، ہم ننگے ہیں — کیا نسرین کے آنسو پونچھنا جرم ہے — اور پھر جبکہ ہر اسکول کے ہر ماسٹر کی اپنی نسرین اسی طرح اشکبار ہو۔ اسی طرح پریشان حال ہو، اس کے کپڑے پھٹے ہوں اور اُس کے جسم کا ایک اک رواں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، گھور گھور کر ہر ایک کو اپنی عریانیت کا احساس دلا رہا ہو۔

وہ اپنی نسرین کے لئے یہ قربانی کرے گا — وہ زندگی سے غداری نہیں کرے گا۔ علم بغیر نانِ جویں کے نہیں پنپ سکتا۔ اگر پودے کو کھاد نہ دی جائے تو خوبصورت پھول کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ حُسن مادہ سے اُبھرتا ہے، مادہ حُسن ہے اور حُسن مادہ — اور کوئی اس بڑی حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔

وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا، اس کا دماغ بیکار سا ہو گیا تھا۔ آج چھ سات روز سے ایک کھیل تک اُڑ کر اس کے منہ میں نہیں گئی تھی اور اسکول ماسٹر کے دماغ نے اپنا فعل کسی حد تک بند کر دیا تھا — اس لئے کہ اس کا جسم غذا سے محروم تھا اور جب غذا نہ پہنچے تو طاقت کہاں سے آئے گی، تو پھر دماغ اپنی قوت کہاں سے حاصل کرے گا اور اسکول ماسٹر کو ہی نہیں بلکہ اس کے اور

دوسرے ساتھیوں کو بھی اسی طرح سات روز گند گئے تھے کیونکہ ان سے چوروں ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کا سا سلوک کیا جارہا تھا۔ ان کو وہ کھانا دیا جارہا تھا جو چوروں اور بدمعاشوں کو دیا جاتا تھا۔ اور اُن میں سے کسی کی سمجھ میں ان کا فلسفہ آتا تھا

گولیاں چل چکی تھیں، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مکمل سکون تھا۔ مکمل امن وامان۔ اور اسکول ماسٹر کی لاش ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی بے نور وبے بصر آنکھیں کھلی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیسے وہ اپنی روایات کو ڈھونڈ رہی تھیں ـــ اشوک اعظم کی روایات کو، رشی منیوں کی روایات کو۔ لیکن کون کہے کہ ان کا وارث اسکول ماسٹر تھا۔ یا وہ جنھوں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔ کالی داس، لوکمان تلک اور پریم چند کی روح اس کے چاروں طرف منڈلارہی تھی ـــ مدقوق اسکول ماسٹر کے چاروں طرف ـــ اور جیل میں مکمل امن وامان تھا۔ اس لئے کہ مرنے والے مر گئے تھے اور اب کوئی روٹی مانگنے والا نہ تھا۔ اور اسکول ماسٹر ہی نہیں مرا تھا اس کے جسم میں تمام کیڑے بھی بیجان ہو گئے تھے جو ایک زمانے سے اس کے جسم سے غذا حاصل کرتے تھے ـــ مدقوق اسکول ماسٹر کے جسم سے ـــ وہ جو اپنی نسرین کا محبت کرنے والا شوہر بھی تھا۔ فلسفی بھی، مورخ بھی، حسن کار بھی اور اسکول ماسٹر بھی ـــ

دودھ اور خون

وہ جاڑوں کی ایک سرد رات تھی جب تاروں کے جھرمٹ میں گول سا چاند چمک رہا تھا اور آس پاس کے تمام تارے مدھم پڑ چکے تھے، آسمان پر رونق تھی اور زمین پر خوفناک سناٹا، جنوری کی سرد ہوا سرسراتی ہوئی اس کے پاس سے نکلی چلی جا رہی تھی اور اس نے یہ سوچا کہ یہ ہوا اس سے کتنی مانوس ہو چکی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کو آئے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں مگر آج بھی اس کو اپنی بستی یاد آ رہی ہے جو اس کے تصور میں بھی ویران ہو چکی تھی، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں مرجھا چکی تھیں، درختوں کے سرسبز پتے سرد ہو چکے تھے اور ناریوں کے گیت فضا میں جذب ہو گئے تھے مگر وہ سرزمین اب بھی اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، وہ مرجھائے ہوئے کھیت اس کو واپس بلا رہے تھے، درختوں کے زرد پتے اس کو آواز دے رہے تھے، پاس والی ندی کا پانی تھما

تھما بہ رہا تھا اور زرفشاں چاندنی بھی اس کے بہاؤ کو تیز نہ کر سکتی تھی اس نے محسوس کیا کہ گویا اس کی بستی کی ندی بھی آج شرمسار ہے کہ وہ اس کو نہ بچا سکی۔ وہ اپنے پانی سے اس گاؤں کے شعلوں کو نہ بجھا سکی اور پوری کی پوری بستی جل گئی، مکان ویران ہو گئے، کھیتیاں تباہ ہو گئیں اور پھر عورت نے اپنی گردن کو زور کا جھٹکا دیا اور وہ احساسات اس کے ذہن میں پھر پہلے کی طرح جذب ہو گئے اس نے چاندنی میں اپنے دوپٹے کو اور اچھی طرح لپیٹ لیا اور اب سینے کے ساتھ اس کا پیٹ بھی وائل کے دوپٹے میں لپٹ گیا مگر وہ جنوری کی مانوس ہوا سرسراتی ہوئی اس کے پاس سے گذرتی چلی جا رہی تھی، اس نے اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس کی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے سینے میں ہوک سی اٹھی اور سردی کا احساس کم ہو گیا۔ اس کے جسم کی جھرجھری ابھی پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ سوچنے لگی، اگر اس کے سینے میں برابر ہوک اٹھتی رہے تو کم سے کم وہ اس سردی کا مقابلہ تو کر سکے گی۔ وہ سردی جو گول سا چاند اپنی کرنوں کے سہارے زمین پر پھینک رہا تھا اور وہ سمٹی سمٹائی اپنے ٹین کے شیڈ میں چلی آئی۔ مگر چاند کی زرفشاں کرنوں نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کے پڑوسی سو چکے تھے۔ بچے میٹھے خواب دیکھ رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں سپنوں میں بچھڑے ہوئے ساجن کو ڈھونڈ رہی تھیں اور بوڑھی عورتیں اپنے بچوں کے خیال کر کے دھیرے دھیرے آنسو

بھاری تھیں کہ کہیں ان کی آواز سے کوئی جاگ نہ جائے اور پھر یہ بھی تو خیال تھا کہ سب کے دکھ یکساں ہیں اور وہ سب ایک دوسرے کے دکھوں کو جانتے ہیں اور وہ کتنی بار ان واقعات کو دہرا چکی تھیں اور اب تو ان واقعات کے آنسو بھی ختم ہو چکے تھے اور سب اپنے غموں کو ایک دوسرے کے آنسوؤں میں تحلیل کر رہے تھے۔

وہ شیڈ کے نیچے آکر بیٹھ گئی اور اس نے اپنی رگوں میں اینٹھن سی محسوس کی اور وہ غصہ سے کانپ اٹھی، اس کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر پیٹ ہی میں اس درندے کو مروڑ دے تو پھر وہ اس کی شکل کو بھی نہ دیکھ سکے گی اور کم از کم اس کی روح کو تسکین پہنچے گی۔ وہ درندہ اس کے جسم میں رینگ رہا تھا اور اپنے بڑے بڑے دانتوں سے اس کے جسم کی ہڈیاں چبا رہا تھا، کاش وہ اس کے سامنے ہوتا تو وہ اس کی ہڈیاں مروڑ کر رکھ دیتی، مگر وہ اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی اس کا چہرہ لال ہو گیا اور اس نے پیٹ پر ٹھنڈا ٹھنڈا ہات پھیرا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اس کے قبضے میں آ بھی سکتا ہے یا نہیں مگر وہ اس کی دسترس سے باہر تھا، صرف اس کا اپنا ٹھنڈا ہات اس کے جسم کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا اور وہ اسی خیال سے مطمئن سی ہو گئی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ برابر اپنا ہات پیٹ پر پھیرتی چلی جا رہی تھی، اس نے اپنی سیاہ آنکھیں چاند کے ہالے

میں ڈال دیں۔ وہ چاند جو شیڈ میں اپنی پوری روشنی کے ساتھ گھسا ہوا تھا۔

پھر وہ درندہ پرندے کی طرح اس کے پیٹ میں پھڑپھڑانے لگا اور اس نے محسوس کیا گویا وہ پرندے کی طرح بیتد ہے اور وہ اس سے روٹی مانگ رہا ہے۔ آج دن کی روٹی۔

"میں خود بھوکی رہوں گی اور تجھے بھوکا ماردوں گی"۔ وہ چلائی اور اس کی آواز دور فضا کے خلا میں گونجتی رہی، اس نے محسوس کیا کہ وہ انسان جس نے اس کی عصمت پر ڈاکہ ڈالا تھا، جس نے اس کی معصوم اور کنواری چھاتی پر اپنے ہاتھوں کے نشان ڈال دیئے تھے، وہ انسان مسکرا رہا تھا۔ اس کے جبڑوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی مگر پھر فوراً ہی اس نے اپنی مٹھیوں کو بھینچ لیا، مگر وہ انسان نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا، وہ انسان جس نے اس کے جسم میں ایک اور جان ڈال دی تھی۔ جس کا بوجھ اٹھائے وہ مہینوں سے پھر رہی تھی۔

"میں تیری پرورش نہیں کر سکتی تو نے میرے گھر کو تباہ کر دیا ہے تو نے میری تمناؤں کو مسمار کر دیا ہے" اس کی دونوں مٹھیاں بدستور بھینچی ہوئی تھیں۔ کتنے دن گذر گئے تھے اور وہ خنزیر اس کے جسم میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کے جسم سے خون چوس رہا ہے۔ زندگی سے زندگی لے رہا تھا چراغ سے چراغ جل رہا تھا ــــــ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے کنوارپنے

کوکسی نے اس کی مرضی کے خلاف موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس دھرتی میں بیج پڑ چکا تھا جو ابھی تک کنواری تھی لیکن دھرتی کے سینے میں وہ بیج اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا اور فضا میں بس اب جھانکنے ہی والا تھا، وہ چاہتی تھی کہ اپنے جسم سے اس بیج کو نکال کر پھینک دے کیونکہ وہ کانٹے کی طرح اس کی روح میں چبھ رہا تھا — لیکن جب اس کے منگیتر کو معلوم ہوا کہ اس کی ہونے والی بیوی بانجھ نہیں ہو سکتی بلکہ وہ اپنے جسم میں ایک انسان کی پرورش کر رہی ہے، مخالف فرقے کے ایک نمائندے کو پال رہی ہے تو انتقام کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے کام کو اور تیزی سے شروع کر دیا — وہ غنڈوں کے جھنڈ میں شامل ہو گیا تھا۔ اور فساد کے شعلوں میں تیل چھڑک رہا تھا اس لئے کہ اس کی ہونے والی بیوی ان معصوم مجسموں میں سے تھی جنہیں قربان کی روایات نے تراشے تھے۔ جن پر نہ ہونے کا سایہ منڈلا رہا ہے، ایک بچے کو جنم دینے والی ہے۔ اس کی کومل اور کنواری چھاتی پر جنسی نشان ثبت ہو چکے تھے اور وہ تیزی سے اپنے مخالف فرقے کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا اس لئے کہ ان کے ایک ہم مذہب نے اس کی تمناؤں کو مسمار کر دیا تھا اور وہ شام کو اپنے شیڈ میں لا کر ایک ضرب ٹیک دیا کرتا تھا۔

"میری جان! دیکھو یہ سر چھو کر دیکھو، یہ بے جان ہے۔ جب میں نے اس کو مارا، تو بس آخری بار تڑپا اور اس کی آنکھ میں آخری بار ایک عکس جھلملایا تھا۔ وہ عکس جس نے ہمارے گھر بار کو تباہ کر دیا تھا، جس نے ہمیں بے وطن کر دیا اور یہ سر کس قدر معصوم نظر آتا ہے مگر اس کے بھائیوں —— اف ——"

اور وہ نڈھال ہو جاتا۔ پھر زمین پر اس طرح اوندھے منہ گر پڑتا جیسے وہ اس سر کی طرح بے جان ہو ـــــ

"میں کل پھر جاؤں گا اور اسی طرح انتقام لوں گا۔"

چاند کی کرنیں بدستور اس عورت کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں جو اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہی جسم پر پھیر رہی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اسی طرح اس اجنبی کو تکلیف پہنچائے جس نے اس کی روح میں زہر گھول دیا تھا، اور وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ اپنی کوکھ سے ایک سانپ ہی کو جنم دے تو وہ اس سے ہزار گنا بہتر ہوگا کہ وہ انسان ہو۔ ہزاروں نظریں اس کے جسم میں گڑ کر رہ گئیں، وہ نظریں جو ہر روز اس کے جسم میں چبھا کرتی تھیں ـ جن میں زہر خند ہوتا تھا اور اس کے شریانوں سے لہو ٹپکنے لگا۔ لیکن اس کے منگیتر کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی ـ

"میری محبوبہ ـــــ تو اداس مت ہو۔ اس لئے کہ میرے دل میں انتقامی شعلے بھڑک رہے ہیں اور میرے دل میں محبت کی قندیل بھی اسی طرح فروزاں ہے۔ وہ بجھی نہیں اور نہ کبھی بجھ سکتی ہے اس لئے کہ تیری محبت ہی نے اس نفرت کو جنم دیا ہے۔ وہ نفرت جو میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے ـــــ اور میں انتقام لوں گا اس انسان سے جو تیرے جسم میں انگڑائیاں لے رہا ہے، جو تیرے جسم کو مہینوں سے گھن کی طرح کھا رہا ہے ـــــ میری محبوبہ" اور وہ آواز دھیرے دھیرے چاند کی کرنوں کے سہارے اٹھ گئی اور وہ شیڈ کے باہر رات کے سناٹے میں اس کو ڈھونڈنے

لگی مگر وہ ننھا برابر اس کے جسم میں اینٹھ رہا تھا۔ مچھلی کی طرح اس کے جسم میں تیر رہا تھا۔

اس کا دوپٹہ ڈھلک گیا اس نے دیکھا کہ اس کی کنواری چھاتی اور زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ جمپر اور زیادہ تنگ ہو گیا تھا اور اس نے یونہی اپنے گلے کے بٹن کھول دیئے اس کو معاً خیال آیا کہ یہ غذا ہے جو اس بچے کے لئے آسمان کی رفعتوں سے اس زمین تک پہنچی ہے جو اس کے جسم نے اپنی کوششوں سے مہیا کی ہے مگر وہ ہرگز اس کو منہ نہ لگانے دے گی اور اس کو اچانک محسوس ہوا جیسے وہ بچہ آکر اس کی چھاتی سے لپٹ گیا ہے اور اس کی چھاتی سے خون چوس رہا ہے۔ اس کا نفس تیز ہو گیا۔

اس نے گھبرا کر زور سے جھٹکا دیا مگر وہ ننھا ابھی تک اس کے پیٹ میں رینگ رہا تھا اور چاند دور سے مسکرا رہا تھا ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی جس سے اس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی اور وہ ساکت و جامد کھڑی ہو گئی کپڑے اس کے جسم سے لپٹ کر رہ گئے۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی، اس نے اپنے جسم میں تناؤ محسوس کیا۔ اور اندر کوئی شے منجمد ہو کر پگھلنے لگی اور وہ وہیں بیٹھ گئی۔

پاس پڑوس میں ہر طرف سناٹا تھا، تمام پناہ گزیں سو چکے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح شیڈ میں بیٹھی ہوئی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر پھر درد کی شدت نے انتظار کے احساس کو کم کر دیا۔۔۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ وہ بستی میں ابھی تک انتقامی مشعلیں فروزاں کئے گھوم رہا تھا، تھوڑی دیر کے لئے اس نے سوچا کہ یہ شعلے اس کے اپنے جسم کو جھلس رہے تھے۔ اسی جذبہ نے اس کے جسم میں یہ زہر گھولا تھا وہ پھر پیٹ

پر ٹھنڈا ٹھنڈا ہات پھیرنے لگی، وہ متحرک جسم بدستور اس کے جسم میں رینگ رہا تھا اس کی چھاتی بڑھتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ اس نے محسوس کیا کہ اس میں زندگی کانپ رہی تھی وہ حیات پرور ہو سکتی تھی، مگر مادرانہ جذبہ، فضل کے سناٹے، اپنی پرانی بستی کی خوفناک تباہی کے درمیان کہیں گم ہو گیا تھا۔ لیکن درد پھر بڑھنے لگا، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے کسی نے چاقو بھونک دیا ہو اور درد پیڑو میں آکر اس کے جسم میں پھیلنے لگا۔ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں بھینچ لیا، ایک لمحے کے لئے درد رک گیا، مگر پھر اس کو یقین ہو گیا کہ آج درندہ پوری قوت سے اس پر دھاوا کر رہا تھا، اب درد کی شدت کم ہو چکی تھی مگر وہ بھوت گولہ بن بن کر اس کے پہلو میں اینٹھ رہا تھا۔ پھر جیسے کسی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر آرا چلا دیا ہو اور وہ درندہ ہاتھوں میں تلوار لئے اس کے پہلو کو چیر رہا تھا اور بس اب وہ مرنے والی تھی۔ اب وہ صبح کی روشنی نہ دیکھ سکے گی آسمان سے پھوٹتی ہوئی سرخ سرخ روشنی، وہ اپنے منگیتر کو بھی نہ دیکھ سکے گی، وہ منگیتر جو اس کی محبت سے نفرت کے شعلے لے کر ساری بستی بھسم کر دینا چاہتا تھا کاش وہ آجاتا۔ پھر اس کو کبھی نہ دیکھ سکے گی اور یہ جذبہ اس کے ذہن میں یونہی گھومتا رہا اور وہ اس خیال کو شکل بھی نہ دے سکی۔ کیونکہ درد اب تیزی سے اس کی کمر اور پہلو کو چیر رہا تھا۔ اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کی شریانوں سے لہو ٹپک رہا تھا، ہڈیاں موم بن کر پگھل رہی تھیں، ہر شے رقیق ہو کر اس کے جسم سے بہے چلی جا رہی تھی۔ اور اگر کوئی جامد تھی تو وہ درندہ جو اس کے پیٹ میں سے سرک کر پیڑو میں لرز رہا تھا۔ اس کی چھاتیوں میں خون رینگ رہا تھا، اس کا تنفس تیز ہو گیا، اس کی کمر پر جیسے کوئی ہتھوڑے

مار رہا ہو، چاقو سے کاٹ رہا ہو، وہ کراہ رہی تھی مگر وہ تو چیخنا چاہتی تھی۔

"مجھے بچاؤ اس درندے سے جو میرے جسم کو پھاڑے ڈالتا ہے، جو میری رگوں میں سوئیاں چبھو رہا ہے، جو میرے پیڑو میں لرز رہا ہے — جس نے مہینوں میرے جسم کو گھن کی طرح کھایا ہے — مر جاؤں گی۔ مجھے اس درندے سے بچاؤ — میں صبح کی روشنی دیکھنا چاہتی ہوں صبح کی سرخ روشنی۔"

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، وہ اپنے منگیتر کو آواز بھی نہ دے سکی کیونکہ وہ دور کہیں بستیوں میں گھوم رہا تھا، اگر وہ آجاتا تو پھر یہ درندہ — پھر وہ اس سے نجات حاصل کر سکتی تھی کیونکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس درندے سے بھی انتقام لے گا جس نے اس کے جسم کو ناپاک کر دیا تھا۔ جس نے اس کی معصوم تمناؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

وہ اپنا ہات رگڑ رہی تھی، پھر اس کی دونوں مٹھیاں ایک دوسرے سے بھنچی چلی جا رہی تھیں اس کا سر چکرا رہا تھا، اس کی آنکھوں کے گرد حلقے منڈلا رہے تھے، اس کے پیڑو میں وہ درندہ قلا بازیاں کھا رہا تھا۔ اور وہ غیر شعوری طور پر چیخنے لگی، اس کی چیخ فضائیں کراہ بن کر بلند ہوتی جا رہی تھی، گویا وہ چاند اپنی کرنوں کے سہارے اس کو اٹھا رہا تھا۔

وہ پھر اوندھے منہ پڑ گئی، اس کا جسم نڈھال ہوتا جا رہا تھا مگر اس کی ہڈیاں بدستور چیخ رہی تھیں وہ ایک دوسرے سے پیوست ہو کر پھر ڈھیلی ہو جاتی تھیں گویا وہ دھرتی کا سینہ چیر ڈالیں گی اور اس نے مٹھیاں کھول دیں اور ٹھنڈی زمین کو کریدنے لگی پھر وہ زخمی شیرنی کی طرح زمین پر ہات پاؤں مارنے لگی مگر وہ کیڑا ابھی تک رینگ رہا تھا۔ اس کے جسم کی ہڈیاں

پستی چلی جارہی تھیں اور وہ درندہ اس کے جسم پر لگاتار کچوکے لگا رہا تھا، اس نے ہزاروں زخم کر دیئے تھے، اس کے جسم میں ناسور ہو گئے تھے، وہ ناسور جو ان گنت تھے۔ اس کے جسم کے ریشے ریشے میں وہ ناسور نظر آ رہے تھے، وہ چیختی چلی جا رہی تھی مگر وہاں ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی وہ چاندنی جو ویرانی کی طرح اپنی چادر پھیلائے ہوئے تھی اور وہاں ہر طرف سناٹا تھا اور ایک دردناک چیخ بھی فضا کے سناٹے کو درہم برہم نہ کر سکی۔ دریا میں کنکر پڑی ایک حلقہ بنا اور کنارے تک وسیع ہونے سے پہلے معدوم ہو گیا۔ اور پھر وہی لہریں نرم اور گداز دریا کی گہرائی سے لے کر دریا کی وسعت تک ایک غیر مرئی سناٹا۔

"کیا ہوا؟ کیوں چیخ رہی ہو" اس غیر متوقع آواز سے وہ چونک بھی تو نہ سکی تھی اس کے جسم کا کرب بڑھتا چلا جا رہا تھا، وہ درندہ آج اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔

اس کا منگیتر اس کے سامنے کھڑا تھا، اس کے ہات میں حسب معمول ایک انسان کا سر تھا، اس نے گھبرا کر اس کو اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور وہ سر لڑھکتا ہوا ایک کونے میں جا پڑا، اس کی بے نور و بے بصر آنکھیں اس عورت کی طرف تکنے لگیں اور وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ وہ کس کا سر تھا اور دوسرے لمحے پھر زمین پر سر مارنے لگی، چیخنے لگی۔

"ٹھہرو ـــ کیا کرتی ہو، لیٹی رہو"

اس نے دیکھا کہ وہ درندہ اپنا سر نکال رہا تھا اور اس کی ہونے والی بیوی چیخ رہی تھی، اپنا سر پٹک رہی تھی، اپنے دانت بھینچ رہی تھی مگر وہ اسے زبردستی پھر اسی طرح لٹا دیتا تھا، وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی مگر پھر یکایک وہ خاموش ہو گئی جیسے کسی نے اس کے

جسم سے کانٹا نکال کر پھینک دیا ہو — وہ ہزار پایا اس کے جسم سے چھوٹ گیا تھا اور وہ سکون کے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی، اس نے منہ پھیر کر دیکھا کہ اس کے منگیتر کے ہات میں ایک ننھا منّا جسم تھرتھرا رہا تھا اور پھر وہ ننھا سا انسان چیخ اٹھا اور اس کے منگیتر نے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے اس کے دانت ایک دوسرے سے پیوست تھے مگر اس کے جسم کی ہڈیاں ڈھیلی ہو چکی تھیں اور وہ بے جان لاش کی طرح بے حس پڑی ہوئی تھی وہ معصوم چیخیں فضا کی رفعتوں میں پرواز کر رہی تھیں۔ جب اس کی نظر اس کٹے ہوئے سر پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ اس کی بے نور و بے بصر آنکھیں اُس کے بچے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"ہٹاؤ اس سر کو یہاں سے" اس نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بھینچ لیں، آنسوؤں کے قطرے اس کے چہرے پر جم چکے تھے اگر پھر دوبارہ اس نے آنکھ کھولی تو بچہ اس کے منگیتر کے ہاتھوں میں چیخ رہا تھا، وہ ایک لمحہ تک تو دیکھتی رہی پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"میرا بچہ —" اور پیشتر اس کے کہ کوئی جواب ملے ماں نے جھپٹ کر بچے کو اس کے ہاتھوں سے چھین لیا اور اپنی آغوش میں چھپا لیا، گرم گرم — وہ خوف و ہراس سے کبھی اپنے منگیتر کی جانب دیکھتی اور کبھی اس سر کی طرف جو کونے میں پڑا ہوا اپنی بے نور و بے بصر آنکھوں سے اس کی جانب تک رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے لرز رہے تھے۔

ماں کانپ رہی تھی اور بچہ اس کی پیار بھری آغوش میں تھا، درندہ فضا کے بازوؤں میں پرواز کر چکا تھا اور اس کا منگیتر سر جھکائے ہوئے کھڑا تھا اور ایک سر نہیں بیسیوں سر تاریکی میں اس کی جانب تک رہے تھے اور اس نے محسوس کیا کہ آج بہت سردی پڑ رہی تھی اس لئے

کہ اس کے جسم کے شعلوں میں گرمی کم ہوتی جارہی تھی، وہ انگارے سرد پڑتے جارہے تھے۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے، بڑے بڑے ہو ـــ بے شرم"

اس کی آواز میں نقاہت بڑھ رہی تھی لیکن آنکھوں میں نفرت کے شعلے بجھ گئے تھے اور وہ شرما رہی تھی اس ساری فضا سے، چاند کی گستاخ کرنوں سے اور اپنے آپ سے، اس نے ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے کپڑوں کا ایک بنڈل اٹھا لیا۔ چاند کی کرنیں اس خاموشی اور تنہائی میں سردی سے لرز رہی تھیں، وہ ایک ہاتھ میں بچے کو لئے ہوئے تھی ـــ اس کے دانت بج رہے تھے اور جنوری کی مانوس ہوا سرسراتی ہوئی اس کے پاس سے گذرتی ہوئی چلی جارہی تھی اس نے اپنے سینے میں سردی محسوس کی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے سینے کی رگیں کھنچتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی چھاتیوں میں سپید سپید دودھ بہہ رہا تھا اور فخر سے اس نے اپنے سینے میں تناؤ محسوس کیا اس لئے کہ وہ حیات پرور تھا اور ماورانہ جذبہ فضا کے سناٹے کے باوجود اپنے پورے شباب پر تھا۔ اس کی نظر دھرتی پر پڑی جس پر دودھ بہہ رہا تھا ـــ سفید دودھ اور سرخ خون ـــ حیات اور زندگی کا سرچشمہ، اور وہ پڑا ہوا سرنڈھال ہوگیا تھا۔ وہاں ہر طرف زندگی اور حرکت کے آثار نظر آرہے تھے۔ موت ہار گئی اور زندگی کامراں ـــ

باہر اس کا منگیتر سردی میں کانپ رہا تھا اور اس کو بلانا چاہتا تھا مگر اس کا نام ـــ مریم تھا یا سیتا ـــ یہ اس کو یاد نہ تھا اور وہ فضا کے خلا میں مریم اور سیتا کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کے منگیتر کے پاس سے جنوری کی سرد ہوا سرسراتی ہوئی چلی جارہی تھی اس نے ایک جھرجھری سی لی مگر دوسرے ہی لمحے وہ ہوا شیڈ کے اندر داخل ہوگئی جہاں دھرتی پر سفید دودھ اور سرخ خون بہہ رہا تھا حیات کا سرچشمہ سفید دودھ اور سرخ خون ـــ